تنقیدی نقوش

تنقیدی نقوش

ڈاکٹر عبدالقیوم
استاد شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی

مشتاق بک ڈپو، کراچی
سنہ ۱۹۶۳ء

بار اوّل: ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۶۳ء

کتابت: ۔۔۔۔۔۔ حبیب اللہ

طباعت: ۔۔۔۔۔۔ انٹرنیشنل پریس کراچی

تعداد اشاعت: ۔۔۔۔۔۔ ایک ہزار

قیمت: ۔۔۔۔۔۔ تین روپے پچہتر پیسے

ناشر

اکرام احمد

مقامِ اشاعت

مشتاق بک ڈپو، کراچی ۱

ترتیب

اِنتساب

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

اور

اُن کے رفقائے کار کے نام

جنھوں نے

جامعہ کراچی کے اعلیٰ مدارج میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا

ث

دیباچہ

اُردو تنقید کا بڑا سرمایہ مضامین کی شکل میں ہے بعض مضامین میں بلاشبہ بڑی وسعتِ خیال اور بلندیٔ فکر ملتی ہے لیکن بہت سے مضامین ایسے بھی ہیں جن سے نہ تو کوئی ادبی گتھی سلجھتی ہے اور نہ تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے۔ تاہم یہی مضامین ہیں جو آج شعر و ادب کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں اپنی خیال انگیز کیفیت کے باوجود یہ مضامین کسی تصنیف کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اُردو میں مختلف موضوعات پر مستقل تصانیف پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ میدان ابھی خالی پڑا ہے لیکن کسی ایک موضوع پر غور کرنے اور اس کے ہر پہلو کا جائزہ لینے کے لئے ایک خاص ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کام ذرا مشکل ہے ابھی تک اس کے لئے پوری طرح فضا سازگار نہیں ہوئی ہے۔ اس میں اس دور کی اقتصادی اور نفسیاتی اُلجھنوں کو بھی بہت دخل ہے۔

اُردو تنقید پر مغربی اصولِ تنقید نے خوشگوار اثر ڈالا ہے اور اس نے ایک سائنٹفک اور معتدل انداز عطا کیا ہے جس سے ادبی اثرات کے پھیلنے میں بہت مدد ملی ہے اور ادب کا مقصد زیادہ وسیع، واضح اور ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے لیکن مغربی اثرات نے ہمارے لئے بہت سی اُلجھنیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ بعض لوگوں نے مغربی اصولِ تنقید کو آفاقی تسلیم کر کے اردو ادب کو اسی معیار پر جانچنے پر زور دیا ہے جس سے مفید باتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی حوصلہ شکن باتیں بھی عام ہو گئیں مغربی اصولوں کی ہمہ گیری سے انکار نہیں لیکن کسی زبان کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت مقامی اثرات کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش نے پڑھنے والوں کے دل میں ایک تزلزل پیدا کر دیا ہے۔ نقادوں کا فرض ہے کہ وہ قارئین کو اس کشمکش سے نکالنے کی کوشش کریں۔ نقاد

قاری اور فنکار کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے غالباً ادب کا مطالعہ اس طرح زیادہ مفید ہوگا۔

اس مجموعہ میں گیارہ مضامین شامل ہیں ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں اور بعض غیر مطبوعہ بعض مختصر بھی ہیں اور کسی جگہ ایک بات کسی جگہ دہرائی گئی ہے مقصد کی وضاحت کی خاطر اور مختلف اوقات میں لکھنے کی وجہ سے ایسا ہونا ناگزیر تھا تاہم کوشش کی گئی ہے جو بات کہی جائے واضح اور صاف ہو، عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے بعض رائیں زیادہ مستحکم ہو جاتی ہیں۔ بعض خیالات کا رُخ بدل جاتا ہے ان مضامین میں بھی کہیں کہیں ردوبدل کیا گیا ہے لیکن کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

تنقیدی نقوش کی اشاعت کے لئے محبی انیس خورشید صاحب صدر شعبہ لائبریری سائنس کراچی یونیورسٹی اور مکرمی اکرام احمد صاحب مالک و مہتمم مشتاق بکڈپو کراچی کا ممنون ہوں کہ ان حضرات کے اصرار اور پرجوش آمادگی نے ان اوراق پریشاں کو ایک مرتب شکل عطا کی۔

عبدالقیوم

شعبہ اُردو کراچی یونیورسٹی

۳۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء

حالی بحیثیت سوانح نگار

اُردو ادب کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔ مغلوں کے سیاسی زوال سے ایک صدی قبل اس کا آغاز ہوا۔ ادبی ترقی کے لئے یہ مدت کچھ زیادہ نہیں۔ خاص کر ایسے ماحول میں جس سے ہندوستان دوچار تھا۔ درباروں کی رسم اور شاہی جلال کی موجودگی نے عشقیہ شاعری کے لئے فضا زیادہ سازگار کردی تھی۔ چونکہ زندگی کا واضح شعور لوگوں کے سامنے نہ تھا اور وہ طلسمات کی دُنیا میں کھوئے ہوئے تھے اسلئے نثر کے ارتقا کے لئے فضا سازگار نہ ہوسکی۔ خود فارسی زبان کی ہزار سالہ تاریخ میں جو نثر پیدا ہوئی تھی وہ بھی پند و نصائح اور قصّوں کہانیوں تک محدود تھی۔ البتہ عربی ادب اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں میں صداقت، سچائی اور حقیقی واقعات سے مانوس تھا۔ لیکن انقلابات نے علوم و فنون کی حقیقی رُوح کو بھی بہت مُردہ کردیا اور تصنّع بناوٹ اور مبالغہ کا رنگ غالب آگیا۔

اردو ادب کے سامنے نثری کارناموں کے جو نمونے موجود

تھے وہ فارسی اور عربی کے تھے۔ اس لئے یہاں بھی جو کچھ نثر کا سرمایہ ملتا ہے وہ خیالی قصّوں اور دیو پری جن کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس نگار خانے میں کوئی ایسی تصویر نہیں ہے جو متحرک ہو کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ یہ کیفیت انیسویں صدی کے نصف تک طاری رہی، بالآخر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے حالات کا رُخ بدل دیا اور انگریزوں کے تسلط اور مغربی اقوام سے میل جول نے ایک نئی راہ پیدا کی۔ زندگی کی پیچیدگیاں سامنے آنے لگیں اور اس کے مختلف شعبوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے جدید زندگی کی ضرورتوں کی طرف لوگ متوجہ ہونے لگے۔ اس زمانہ میں سرسید کی برکت سے اُردو ادب نے مقصدی رُخ اختیار کیا اور حالی نے ادب کو زندگی کی اُمنگوں سے روشناس کرانا شروع کیا۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں نئے علوم سے واقفیت اور سماجی اصلاح کا جذبہ بڑی شدت سے نظر آتا ہے۔ مولانا حالی کا یہی جذبہ آگے چل کر ایک منظم صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مشاہیر کے حالاتِ زندگی کی ترتیب اسی جذبہ کی مظہر ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "حیاتِ سعدی" ہے اُردو ادب میں یہ پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے جو مشرقی تذکرہ نویسی سے ہٹ کر جدید سائنٹفک بنیادوں پر لکھی گئی ہے۔ گویا حالی نے اُردو ادب میں سوانح نگاری کے فن کی داغ بیل بھی ڈالی اور اسے پروان بھی چڑھایا۔

حیاتِ سعدی

حالی ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے اور اُن کا مطمحِ نظر تمام تر قومی اور اخلاقی تھا۔ سعدی کی شخصیت ایک عالمگیر شخصیت ہونے کے علاوہ اہلِ ہند کے لئے ایک مانوس شخصیت تھی۔ خاص کر مسلمانوں کے دلوں میں اِس شخصیت کا عرصہ سے ایک غیر معمولی احترام چلا آتا تھا۔ اس لیئے حالی کو بھی سعدی کی آواز میں اپنی رُوح کی آواز سُنائی دی۔ سعدی کا کلام اسلامی تمدن کا ایک جزو ہو چکا تھا۔ اس لیئے حالی نے سعدی کی خوبیاں بیان کرنا قوم کے حق میں چنداں مفید خیال کیا۔ دین دنیا کی بھلائی انھیں سعدی کے نغموں اور جواہر پاروں میں نظر آئی حالی کو انسانی شرافت اور نیکی کی معراج سعدی کی شخصیت میں دکھائی دی۔ انہی جذبات نے مولانا کے دل میں ایک ولولہ پیدا کیا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حالی شخصیت پرست تھے بلکہ حالی ہمیشہ شخصیت کو اس کے سیاسی سماجی پس منظر میں دیکھتے تھے۔ اس لئے وہ ہر اُس لَے پر وَجد کرتے نظر آتے ہیں جس میں زندگی اور پایندگی کے آثار نظر آئیں۔ جہاں عبرت و نصیحت کے مرقع مل سکیں۔ حالی پر کہیں کہیں رقت بھی طاری ہو جاتی ہے اور قومی بھلائی کے پیش نظر عقیدت مندی کا بھی اظہار کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً سعدی نے نام نہاد خلیفہ مستعصم باللہ کا مرثیہ لکھا۔ اس احساس کے باوجود کہ خلیفہ کی گمراہیاں سوسائٹی کے لئے مصیبت کا باعث تھیں اور اس کا وجود اسلامی سوسائٹی

کے لئے تباہ کن تھا لیکن اسلامی حمیت کے مظہر اور عربوں کی آخری یادگار رہونے کی وجہ سے حالی کا دل بھر آتا ہے۔ لیکن جو چیز مولانا حالی کو اپنے عہد اور اپنے بعد آنے والے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا سائنٹفک نقطہ نظر ہے۔ مولانا کو جہاں دین کے اُبلتے ہوئے چشمے کے خشک ہو جانے کا افسوس ہے وہاں دنیوی امارت کے لٹ جانے کا بھی غم ہے۔ غرض مولانا حالی نے ایک شاعر اور مصلح کی زندگی کے واقعات اور کمالات کو اُجاگر کرنے میں تمام قومی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال رکھا ہے اور کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ انہیں ہر قدم پر اس کا احساس ہے کہ اب بیوگرافی فقط سوانح نویسی نہیں رہی بلکہ سیرت نگاری ہو گئی ہے اب تذکرہ نویس کا کام فقط کارنامے گنانا نہیں بلکہ شخصیت کو بے نقاب کرنا ہے۔

جہاں تک واقعات کی تحقیق کا تعلق ہے اُس میں پوری چھان بین سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ ان تمام بے سرو پا باتوں کی تردید کی گئی ہے جو شیخ کے ساتھ وابستہ کر دی گئی تھیں۔ مثلاً شیخ کا سومنات کے مندر میں جانا اور پجاری بن کر ایک عرصہ تک سومنات میں قیام کرنا۔ امیر خسرو سے ملاقات کے لئے ہندوستان تشریف لانا اور زبان ریختہ میں شعر کہنا وغیرہ۔

تنقیدی حصے میں شیخ کی شاعرانہ فضیلت اور اخلاقی حیثیت کو بخوبی واضح کیا ہے مگر جہاں اُن کے نقطہ نظر اور واقعات اور حالات

میں تصادم ہو جاتا ہے وہاں مولانا کا نقطہ نظر غالب آنے لگتا ہے۔
شیخ نے جہاں بہت سے نوادر پیش کئے ہیں وہاں ہزلیات کا بھی ایک دفتر چھوڑا ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"شیخ کے کلیات کا سب سے اخیر حصّہ مجموعہ ہزلیات ہے یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک نہایت بدنما مسّہ ہے۔ حضرت نے اس حصّہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے رکھ کر خوب آزادی اور بے باکی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ، لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں"

مولانا نے شیخ کی اس بدنمائی کو دھونے اور اُن کے تقدس کو باقی رکھنے کے لئے یہی ایک عربی عبارت کا حوالہ دیا ہے کہ شیخ نے ایک شاہزادے کے خوف سے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے ورنہ شیخ سے ہرگز یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اِن خرافات کا مصنف ہو سکے اس کے اسباب کچھ ہی ہوں مگر اتنا یقینی ہے کہ اِن مطائبات کی وجہ سے شیخ کی برگزیدگی کا رنگ ہلکا پڑ جاتا ہے۔ اور جس قدر واقعات پر غور کیا جائے یہ رنگ اور زیادہ ہلکا ہوتا جاتا ہے حتّٰی کہ شیخ ایک عام انسان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اِن ہزلیات کو شیخ کی مصلحت اندیشیوں کی بجائے اُن کی مرنجاں مرنج زندگی کا آئینہ کیوں نہ سمجھا جائے

شیخ جو پجاری بھی بنا اور مجاور بھی۔ اُس نے شراب خانے بھی جھانکے اور حرم محترم کی بھی زیارت کی۔

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیخ جیسے برگزیدہ شخص سے ایک شہزادے کو اس طرح کے مطائبات کی اُمید کیسے ہو سکتی ہے۔ کیا اُس نے شیخ کے ہزلیات کا کوئی مجموعہ پہلے دیکھا تھا یا اس کے کان میں شیخ کی بحیثیت ہزل گو شہرت پہنچی تھی۔ اگر یہ سب صحیح نہیں ہے تو پھر یہ ولولہ انگیزی کیسی۔ کیا ایسے فرمائشی اشعار میں اس قدر گہرائی آسکتی ہے۔ بلکہ یہ ممکن ہے کہ شیخ نے اپنے کمالِ فن دکھانے کی وجہ سے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہو۔ شیخ کے جو حالات کتب میں مرقوم ہیں اُن سے شیخ کی خود نمائی ظاہر ہوتی ہے۔

غرض مولانا حالی نے واقعات کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ نہیں کیا ہے جس سے شیخ کی واضح تصویر سامنے آسکے۔ مولانا حالی کی پیش کردہ مثالوں سے ہمارے سامنے شیخ کی ہزلیات کا صحیح نقشہ نہیں کھنچتا البتہ کلیات کے دیکھنے سے اُن کے رنگ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اُنھوں نے شیخ کی خوبیوں کی دلفریبی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اگر مولانا حالی پر اخلاقی نقطہ نظر کا غلبہ نہ ہوتا تو سعدی کی تصویر زیادہ مکمل ہوسکتی تھی۔ لیکن حیاتِ سعدی میں حالی نے مشرق کی سرزمین [redacted]

پہلے ایک ایسے شخص کی زندگی کے تاریک پہلو کی طرف بھی اشارے کئے ہیں جس کی شہرت کا غلغلہ تمام دنیا میں ہو چکا تھا اور جس کے اقوال اور اشعار ہیں [illegible] کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں حالی کا انداز نرم اور ملائم ضرور ہے لیکن مشرقی سوانح میں یہ اس عمارت کی پہلی اینٹ ہے جسے آگے چل کر مکمل ہونا ہے۔

یادگارِ غالب حالی کی سوانح نگاری کی دوسری اہم کڑی یادگارِ غالب ہے۔ حیاتِ سعدی کا انداز یہاں بھی نظر آتا ہے تقریباً چار سو صفحات میں صرف ۹۶ صفحے حالاتِ زندگی کے نذر کئے گئے ہیں۔ تنقید اور تحقیق کا جو امتزاج حالی نے پیش کیا ہے وہ حیاتِ سعدی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ لیکن ادبی پہلو کے اجاگر کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کارنامے زندگی کے بننے میں معاون ہوتے ہیں۔ مرزا کی زندگی کے بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ یادگارِ غالب کے بعد مالک رام نے "ذکرِ غالب" میں۔ غلام رسول مہر نے "غالب" میں اور عرشی نے مکاتیب کے دیباچہ کے ذریعہ یادگار کی تحقیقی ناہمواریوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ابوالکلام کے حواشی نے حالی کی پردہ پوشی اور غالب کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور مولانا مہر نے تحقیقات کے میدان کو زیادہ وسیع کیا ہے۔ خاص کر مرزا کے قید کا واقعہ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ حالی نے مرزا کے بیان پر کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا تھا اور ان کے الفاظ دہرا کر تعلقات کے شیشوں

کو ٹھیس نہیں لگنے دی تھی۔

"کوتوال میرا دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے — میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔

"مجھے سرامیرالدین مرحوم سے معلوم ہوا کہ آمدنی کی کمی کے سبب مرزا نے یہ ڈھنگ اختیار کیا تھا۔ چونکہ زندگی ٹھاٹھ سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور مقروض پریشان حال رہتے تھے۔ اس لئے چاندنی چوک کے بعض بچے اور چند رئیس زادے اُن کے یہاں آتے تھے اِس طرح قمار بازی عام ہو گئی۔ اور مرزا کو بطور مہتمم قمارخانہ ہر بازی میں حصہ ملتا تھا اس طرح ایک اچھی خاصی رقم بے محنت ومشقت وصول ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے چونکہ اچھے کھلاڑی تھے۔ اس میں کبھی کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔" (غالب از مہر ۱۹۶ طبع چہارم)

عرصہ تک تو حکام اُن کے ملاقاتی رہے لیکن آگرہ کا ایک کوتوال تبدیل ہو کر آیا، جو نہ شاعر تھا اور نہ شعر کا قدرداں کیونکر رعایت کرتا اُس نے سختی سے دیکھ بھال شروع کی اور خاص وقت پر مرزا کے مکان پر پہنچا اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے مرزا دھر لئے گئے — دوسرے لوگ روپیہ پیسہ صرف کر کے بچ گئے مرزا کے پاس روپیہ تو

تھا انہیں سفارشیں بہت پہنچا ئیں مگر کام نہ چلا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا حالی ناگوار واقعات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے جاگیردارانہ نظام کی پُرتکلف سماجی حالت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مرزا قمار بازی کی وبا میں گرفتار تھے۔ راقم نے خود اودھ کے شرفا کو اسی طرح کے مشاغل سے دلچسپی لیتے دیکھا ہے اس کے علاوہ سفر کلکتہ اور قیام لکھنؤ کی بعض بنیادی باتوں سے حالی کی تحقیق غالباً ثابت کی گئی ہیں۔ مُلّا عبدالصمد کے اُستاد ہونے کے متعلق تقریباً سب متفق ہیں۔ قاضی عبدالودود (بیرسٹر) نے عبدالصمد کو فرضی اُستاد ثابت کیا ہے۔ دراصل حالی نقاد پہلے ہیں اور محقق بعد میں — اُنھیں واقعات کے رد و قدح سے اس قدر بحث نہیں جس قدر کارناموں سے۔ ایک نقّاد ہمیشہ فن پاروں میں توانائی اور تازگی تلاش کرنے کی طرف مائل رہتا ہے۔ حالی واقعات کی چھان بین سے زیادہ کارناموں کی وضاحت پر متوجہ ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے (LIVES OF THE ENGLISH POETS) میں واقعاتِ زندگی میں کاوش سے کام نہیں لیا ہے۔ لیکن ان کے کارناموں پر غائر نظر ڈالی ہے۔ اگرچہ مولانا کے نزدیک مرزا کی زندگی میں کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ملتا مگر اُن کی دماغی صلاحیتیں اور ظرافت کے نادر نمونے اُنھیں متاثر کرتے ہیں۔ حالاتِ زندگی نامکمل ہونے کے باوجود دیانت داری پر مبنی ہیں۔

۱۰ حالی اگرچہ واقعات کی زیادہ چھان بین نہ کر سکے لیکن انھوں نے شرافت کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالی کا کام سیرت سے فائدہ اٹھانا تھا، کمزوریاں دکھانا مقصود نہ تھا کیونکہ انھیں خوف تھا کہ کہیں وہ لوگ جو مبالغہ کے ساتھ کمالات کا اعتراف کرتے ہیں خامیوں کی وجہ سے کمالات پر پانی نہ پھیر دیں۔ مرزا کی زندگی میں انسان دوستی، وسیع النظری اور لطیف ظرافت کے جو بہترین نمونے انھیں ملے اُن کو بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے مرزا کی قربت سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھایا۔ معمولی تلاش تحقیق سے جو کچھ ملا اُسے بیان کر دیا۔ حالی نے نہ تحسین کی ہے اور نہ ترجمانی بلکہ سوانح ترتیب دی ہے۔

حالی کی صلاحیت مرزا کے شاعرانہ جوہر کو اُجاگر کرنے میں نظر آتی ہے۔ اُن کی اصابت رائے اور بہترین و متوازن تنقید کے اکرام بھی قائل ہیں جو اس وقت تک غالب کے سب سے اچھے نقاد ہیں۔ حالی کا یہ کہنا ہے کہ "خسرو اور فیضی کے بعد مرزا جیسی جامع حیثیات شخصیت ہندوستان کی سرزمین سے نہیں اُٹھی" آج بھی صحیح ہے۔ حالی نے مرزا کے نوادرات کی برتری کو محسوس کیا اور دوسروں کو بھی محسوس کرایا۔ اگر یادگارِ غالب نہ لکھی گئی ہوتی تو غالب کی عظیم الشان شخصیت اس قدر مقبول نہ ہوتی۔ غالب اپنے عہد سے بہت پہلے کی پیداوار ہیں۔ غالب کی دقیق شاعری اور نفسیاتی ژرف بینی منظرِ عام پر نہ آتی۔ غالب کی شاعری لوگوں کے لئے ایک معمہ تھی۔ اس معمہ کا

حل حالی کی دماغ سوزی کا رہین منت ہے۔ حالی نے یادگار غالب کے ذریعے شعر فہمی کا ذوق پیدا کیا۔ اور اردو زبان میں غالب کی فلسفیانہ شاعری کی جو امانت اُردو شاعری کو دی تھی انھوں نے اسے قوم تک پہنچا دیا۔ اکرام نے یادگار کو اُردو سوانح کا معجزہ کہا ہے لیکن ہم اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اس کی بعض بنیادی خوبیوں کے پیش نظر حیات سعدی کی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں اور حالی کی سوانح عمریوں میں دوسرے نمبر میں شمار کرتے ہیں۔ البتہ مقبولیت کے لحاظ سے یادگار غالب کا پہلا نمبر ضرور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا کی شخصیت سرسید کی شخصیت سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مرزا کی شاعری میں جو سحر اور دلفریبی ہے وہ سرسید کی قومی سرگرمیوں اور مذہبی اجتہاد میں نہیں پیدا ہو سکتا۔

حیاتِ جاوید

سوانح نگاری میں حالی کا سب سے بڑا کارنامہ حیاتِ جاوید ہے یہ تیسری اور آخری سوانح ہے۔ یہ کتاب اُردو سوانح نگاری میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور تصویر کشی کا ایک اچھا معیار پیش کرتی ہے۔ ضبط و نظم کی پابندی، شعور کی پختگی اور واقعات کی تلاش کا حسین امتزاج حالی نے پیش کیا ہے۔ انھیں تمام مشکلات کا احساس تھا اور یہ بھی خیال تھا کہ ایسی سوانح حیات میں اُن سے کیا توقع کی جائے گی۔ حیات سعدی اور یادگار غالب دونوں کے معیار بھی اُن کی نگاہ میں تھے لکھتے ہیں :-

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا معلوم ہونا اُس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیوگرافی کریٹیکل طریقے سے لکھی جائے۔ اُس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اُس کے عالی خیالات کے ساتھ اُس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اُس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انھیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے"

مولانا حالی کو سرسید کی جامع شخصیت کا پورا احساس تھا اور اُن کے انقلابی کارناموں کے پیش نظر یقین تھا کہ سرسید کی سوانح حیات لکھنا اور غیر محتاط رہنا ہنگامہ کو دعوت دینا ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں "لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے — ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرورت

ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے۔ اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے ۔۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُس کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

مولانا حالی کا یہ جذبہ زیادہ زندہ، صحت مند اور جاندار ہے۔ سعدی اور غالب کی بزرگی کے آگے تو وہ جُھک گئے تھے۔ لیکن سرسید کی یاد اُنھیں زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ اس لئے وہ زیادہ مستحکم، جامع اور وسیع پیمانہ پر سرسید کی لائف مرتب کر سکے۔ اس میں مسلمانوں کی پچاس سال کی ذہنی، علمی، مذہبی اور ادبی زندگی کی تاریخ بھی آ کر پیش کر دی۔ یہ سرسید کے کارناموں کی تفسیر بھی ہے اور تصویر بھی۔ حالی نے سرسید کے کارناموں کا محرک اُن کا مذہبی جذبہ بتایا ہے۔ یہ تجزیہ صحیح ہے لیکن ایک طرف مذہبی جذبہ نے اُنھیں اصلاحی کام کرنے پر کمربستہ کیا تو دوسری طرف مسلمانوں کی پستی نے اُن کے کاموں میں زیادہ انہماک پیدا کیا۔ اگرچہ سرسید کی زندگی میں بڑے اُلجھاؤ ہیں اور خود حالی ان کاموں میں شریک ہیں۔ لیکن حالی کا معتدل انداز اور اُن کی دیانت انھیں بدگمان نہیں ہونے دیتی۔ نظر کی گہرائی اور قلب کی وسعت اُنھیں صحیح راہ سے بھٹکنے نہیں دیتی۔ اس توازن، مُدلل اور سنجیدہ نقطۂ نظر کے باوجود حالی کا بڑھا ہوا اخلاقی جذبہ انھیں ناگوار اور متنازعہ فیہ مسائل پیش کرنے سے روکتا ہے۔ اکرام کا بھی خیال ہے کہ حالی نے سرسید کی سوانح کا حق ادا نہیں کیا۔

لیکن یہاں نظریات کا اختلاف نہیں بلکہ فنی اختلاف ہے۔

سرسید کی شخصیت میں بڑی عظمت تھی۔ اُن کے دوست اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ بعضوں نے اپنے عقیدہ اور وطن کو محض اُن کی رفاقت میں تج دیا تھا۔ انھیں دوسروں سے کام لینا خوب آتا تھا۔ دوست بھی انھیں بڑے وفادار ملے تھے۔ لیکن آخری دَور میں سرسید پہ کچھ ایسا ڈکٹیٹرانہ رنگ غالب آگیا تھا کہ وہ کسی کی نہ سنتے تھے۔ غیر معمولی کامیابیوں سے جہاں انھیں اپنی اصابت رائے کا یقین ہو گیا تھا وہاں ضد کا مادہ بھی اُبھر آیا تھا۔ جب کالج کا ٹرسٹی بل پیش ہوا اور کالج کی سکریٹری شپ کا مسئلہ زیر بحث آیا تو اس میں سرسید کا مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سے یہاں تک اختلاف بڑھا کہ سمیع اللہ صاحب نے کالج سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ ایک فرد کا اختلاف نہ تھا بلکہ چند اصولی اعتراضات تھے جن کا رفع کرنا ضروری تھا۔ مولانا حالی نے اس اختلاف کا تذکرہ ضرور کیا ہے لیکن واقعہ کو اس انداز سے لکھا ہے کہ ایک ناواقف شخص سوائے اس کے کہ حالی کے دلائل کو بے چون و چرا قبول کرلے اس کے لئے اور کوئی چارہ نہیں۔ یہاں سوانح نگار کا فرض تھا کہ تمام واقعہ بے کم وکاست بیان کر دے تاکہ ظاہر ہو سکے کہ کون حق پر تھا۔ حالی کی سرسری تحریر کے باوجود آگے ایسے حالات ملتے ہیں کہ وہ تمام واقعہ کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتے ہیں۔ میری کا مراد اس

اختلاف سے ہے جو سرسید اور اُن کے رفقا رکار یعنی محسن الملک ، وقار الملک اور خود مولانا حالی کے درمیان پیش آیا۔ تینوں حضرات کے دستخط سے پیسہ اخبار لاہور میں ایک بیان سرسید کی پالیسی کے خلاف شائع ہونے والا تھا۔ جسے سرسید کی ناگہانی موت نے روک دیا۔ سرسید انگریز اسٹاف کے ساتھ جو رعایت برتتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر بیک بہت خود سر ہو گئے تھے۔ اور ان کی خودمختاری سے کالج پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود سرسید کا حُسنِ ظن قائم رہا اور انھیں انگریز پروفیسروں میں جو دلکشی معلوم ہوتی تھی وہ آخر دم تک قائم رہی۔ فرشتہ خصلت حالی نے اِس اس واقعہ کا اشارہ نہیں کیا ہے۔ اُن کی مصلحت نے بڑے بڑے اہم واقعات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے چند ہمعصر میں سرسید پر جو مضمون لکھا ہے اس میں انگریز پرنسپل کی سازش کا انکشاف کیا ہے۔ اُس سے انگریزوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے "ایک دن پرنسپل بیک جن کی تحریک سے ڈرل کا نیا نیا انتظام جاری ہوا تھا ہماری جماعت میں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں رنگین ریشمی ململوں کے کئی نمونے تھے۔ فرمانے لگے کہ تم اپنی جماعت کے لئے کون سا رنگ پسند کرتے ہو، میں نے کہا کہ ڈرل کے لئے اس قماش کے کپڑے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتے فرمایا سوال رنگ کا ہے کپڑے کا نہیں۔ غرض ہر جماعت کے لئے الگ الگ

رنگ کی ریشمی ململوں کی شیروانیاں اور پگڑیاں تجویز ہوئیں اور اسی وردی میں ڈرل کرتے تھے۔"

انگریزوں کی کالج سے ہمدردی اور مسلم دوستی کی یہ تصویر تھی، مولوی عبدالحق صاحب آگے چل کر اسی ضمن میں لکھتے ہیں "دنیا کے کسی ملک میں شاید ڈرل پریڈ کے لئے ایسا نازک اور ملائم لباس لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بھی نہ تجویز کیا ہوگا۔ اُن نوجوان طالب علموں کے لئے جو قومی بہبود و ترقی کے لئے جد و جہد کرنے کو تیار کئے جا رہے تھے اور جن سے قوم کی خاطر زندگی کے میدان کارزار میں محنت و مشقت ایثار اور جاں نثاری کی توقع تھی، اس قسم کے لباس میں ڈرل یا پریڈ کرانا جو کسی رہس کے لئے زیادہ موزوں تھا کس قدر نامناسب اور مضحکہ خیز تھا۔"

جب سر سید احمد خاں سے شکایت کی گئی تو انھوں نے غصہ میں فرمایا "اس میں ایک پیچ ہے، وہ میری عمر بھر کی محنت خاک میں ملانا چاہتا ہے۔" لیکن بقول مولوی عبدالحق صاحب، یہ سر سید کی رد عمل تھی جو تھوڑی دیر تک جوش میں رہی اور پھر کچھ نہیں۔ سر سید نے مسٹر بیک کی موجودگی میں اسٹریچی ہال کے اندر کالج کے طالب علموں کے سامنے جیسی پُر معز اور اولوالعزم تقریر کی شاید ہی ویسی تقریر سر سید نے کبھی کی ہو مگر مولانا حالی نے اس قسم کے واقعات کو حیات جاوید میں جگہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اور سر سید احمد خاں کے دل کی یہ بھڑاس صرف اسٹریچی ہال کی

وسیع عمارت میں گونج کر رہ گئی۔ ممکن ہے مولانا حالی اختلافی مسائل کو پیش کرکے فضا کو مسموم نہ کرنا چاہتے ہوں۔

سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں لکھا ہے "رفتہ رفتہ شبلی اور سرسید میں وہ اگلا ارتباط کم ہونے لگا اب وہ وقت آرہا ہے کہ مولانا کو سرسید کے حلقہ سے باہر آجانا پڑے گا۔ گو حیاتِ جاوید میں اس اختلاف کے اسباب جگہ نہ پاسکے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے گم نہیں ہوئے۔ گو کہ ان حالات کی مولانا نے خود کہیں تصریح نہیں کی تاہم ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے۔" اُن کی یہ شکایت کسی حد تک بجا ہے لیکن سید صاحب نے حالی کے اس جملہ کا سہارا لے کر کہ سرسید ایک ڈسپاٹک طبعیت کے آدمی تھے۔ جو مفروضات قائم کئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ سرسید معمولی اختلاف کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ سرسید کے شبلی سے معاملات ان واقعات کی تردید کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سرسید معمولی اختلاف کو برداشت نہیں کرتے تھے اور مولانا شبلی اختلاف رائے سے چوکتے نہ تھے۔ آخر ۱۶ سال کا طویل عرصہ کیوں کر کٹا، واقعہ یوں ہے کہ شبلی مسلسل چھ ماہ تالیف و تصنیف میں بسر کرنا چاہتے تھے۔ سرسید کے رفقاء، بالخصوص اُن کے بیٹے سید محمود اس بات کے خلاف تھے۔ سرسید کشمکش میں تھے کہ کیا کریں لیکن حقیقت ہے کہ سرسید کا جنازہ پہلے نکلا، شبلی نے علی گڑھ بعد میں چھوڑا۔"

ایک طرف تو یہ نازک مسائل تھے جو حیاتِ جاوید کے ابواب میں جگہ نہ پاسکے۔ دوسری طرف اُس کے اوراق میں ایک انسان کی زندگی پھیلی ہوئی تھی جس نے قدیم روایات کے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ بڑے بڑے آئمہ اور مجتہدین کی رایوں پر بے باکانہ تبصرہ کیا تھا۔ قوم کو اس کے تعصب اور جمود پر للکارا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی دِل کی دھڑکنیں زیادہ تیز ہوگئیں۔ اختلاف کے ساتھ خوف سمانے لگا اور ان کا لب و لہجہ درست ہوگیا۔ انگریزی سلطنت کی وفاداری، مغربی علوم کی ترویج نے اس کو دو آتشہ بنا دیا۔ ذہنی حد بندی گروہ بندی سے بدل گئی اور اختلافات کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا جس کا لازمی نتیجہ انتشار اور صرف انتشار تھا۔ خود غرضوں کی بَن آئی، ابن الوقتوں نے بہتے دریا میں ہاتھ دھویا، اختلافات اور گروہ بندیوں کے مظاہرے ہونے لگے۔ ایک طبقہ مشرقی علوم کو جہالت کی نشانی تصور کرتا ہے، دوسرا مغربی علوم کو کذب و افترا کا آئینہ سمجھتا ہے۔ قومی تمدن قومی علوم اور قومی زبان اسی ہنگامہ کی نذر ہوگئے۔

حیاتِ جاوید کے متعلق شبلی کی رائے اچھی نہ تھی۔ وہ اس کو کتاب مناقب اور مدلل مداحی سمجھتے تھے۔ یہاں وہی نقطہ نظر کا اختلاف تھا جو شبلی کو حیاتِ جاوید کی خوبیوں تک نہیں پہنچنے دیتا تھا ویسے وہ حیات سعدی کے مداح تھے۔ اُن کی رائے میں حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے یک رُخی تصویر پیش کی ہے لکھتے ہیں" اکثر لوگوں کا

خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بدطینتی ہے لیکن یہ اگر صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق علمی اور ترقیاں سب برباد ہوجائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال حیات جاوید کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں ؏

اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہیرو کے معائب دکھانے کو بدطینتی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ یورپ کی پیروی پر زور دیتے تھے لیکن یہی شبلی مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو میں یورپ کے مروجہ طریقہ کو خطرناک سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا لیکن موجودہ طریقہ خیانت ہے جو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دُور ہے۔ لیکن چند روز پہلے جو چیز علمی ترقیوں کی بنیاد تھی وہی اپنے ماحول کی رعایت سے خطرناک ہو جاتی ہے۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جو صحابہ کے حالات میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے انھیں ایک خط میں مولانا شبلی لکھتے ہیں صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ لیکن ہر پہلو کو لیجئے اور ان پہلوؤں کو صاف صاف دکھلائیے جن سے آجکل مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں، لیکن اس چشم پوشی کا شکار خود اُن کی سوانح عمریاں ہیں۔ الفاروق المامون الغزالی اور سوانح امام اعظم۔ الفاروق تو ہیروز آف اسلام کے سلسلہ کی

سنہری کڑی ہے۔ اور اُردو ادب کے لئے قابل فخر کارنامہ۔ لیکن یہ تمام سوانح عمریاں فنی حیثیت سے نامکمل اور یک رخی ہیں۔

بہر حال حیاتِ جاوید شبلی کی نگاہ میں وقعت نہ حاصل کر سکی۔ قدیم اور جدید کی رقابت نے ایک دوسرے کو قریب نہ آنے دیا۔ شبلی کو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے بڑی مایوسی تھی۔ انھوں نے اُن کی کم مائیگی اور سطحیت کا جابجا ذکر کیا ہے۔ مولانا شروانی کے ریویو کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر اور ایسے ریویو لکھے جائیں تو کتاب کا زہر بہت کچھ کم ہو سکتا ہے۔ انھیں سید احمد خاں کی پالیسی سے بنیادی اختلاف تھا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ مغربی تعلیم سے مشرقی علوم اور عربی تعلیم کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔ مغربی تعلیم انہیں اسلام سے دُور لے جائے گی اور اس طرح تمام جد وجہد بیکار ہو جائے گی۔ نئے تمدنی اثرات جو ہندوستان میں جنم لے رہے تھے اس سے انھیں شدید اختلاف رہا۔ ایک جگہ مسعود عالم ندوی کو لکھتے ہیں:۔

”مسلمانوں کی اصلی ترقی کی مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے ہیں“ علی گڑھ اُن کے خیال میں نیچریوں کا اڈا تھا جس سے اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا شبلی کے گروہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کیا۔ انھوں نے الہلال اور البلاغ میں حیات جاوید اور سرسید تحریک کے خلاف سخت مضامین لکھے ہیں۔

ان کے لب و لہجہ میں بڑی تلخی ہے اور قدم قدم پہ بدگمانی ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"خواجہ (حالی) مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔ حیاتِ جاوید میں افسوس نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ سرسید مرحوم کے آخری عہد کے حالات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ حیاتِ جاوید لکھنے کا خیال ترک کر دیا تھا اور صاف صاف کہدیا تھا کہ میں ایسے کاموں پر خاک نہیں ڈال سکتا۔ بالآخر انہی معاملات کو پوری رنگ آمیزی کے ساتھ لکھا اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے۔"

اس بیان میں لب و لہجہ کی شدت کے علاوہ حالی کے نقطۂ نظر کو بھی غلط پیش کیا گیا ہے۔ خود مولانا حالی نے اپنے سوانح نگاری کے نقطۂ نظر کی وضاحت حیات جاوید کے دیباچہ میں پیش کی ہے اس کی روشنی میں مولانا ابو الکلام آزاد کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"ایسی حالت میں اس ضروری کام کو (سرسید کی بیوگرافی) لیت و لعل میں ڈالنا اور اس وقت کا انتظار کرنا جو معلوم نہیں اول ہم کو پیش آئے یا سرسید کو ٹھیک نہیں ہے۔ جس طرح ہو سکے اس کام کو اُن کی زندگی میں پورا کر لینا چاہیئے تاکہ جب کبھی موقع آئے اس کو فوراً

شائع کر دیا جائے۔ ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیئے، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں اس غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا۔ جہاں خود سرسید اور ان کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا۔ اور اس کے بعد کئی دفعہ اس کام کے لئے وہاں جاکر ٹھہرا۔ سرسید کا انتقال مارچ ۱۸۹۸ء میں ہوا اور حالی کا ۱۹۱۴ء میں اور اس کے بعد متعدد بار علی گڑھ جانا اور دوسری طرف اسی زمانے میں اس نیک کام سے ہاتھ کھینچ لینے کا ارادہ ظاہر کرنا دو متضاد باتیں ہیں۔ چونکہ حالی کی تحریر ہمارے سامنے موجود ہے اس لئے ہم مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان کی تائید نہیں کر سکتے رہا اختلاف کا سوال وہ اس دنیا میں پیدا ہوتے رہتے ہیں جس قدر قریب سے ان واقعات کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے یہی کیفیت مولانا حالی اور سرسید کے درمیان پیش آئی۔ البلاغ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان لوگوں نے تقلید کا اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے سرسید کی پالیسی۔ یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بُت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ اس کی حکومت میں خلل ڈالے۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بُت بنالیا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم وعمل کا کوئی گوشہ اس سے

خالی نہیں،،

حیاتِ جاوید کے بعد اُردو ادب میں حیاتِ شبلی ایک پُراز معلومات سوانح عمری ہے۔ اس کی اشاعت نے اُردو ادب میں اضافہ کیا ہے، اس پر متعدد ریویو لکھے گئے۔

”حیدر آباد کے ایک پروفیسر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضیلت چھین لیا جو حیاتِ جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا“ [1] بے لاگ رائے لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ مصنف کا قلم اس کے بس میں ہوتا ہے جو چاہے لکھ دے لیکن زمانے کی ناقد نظر کھرے اور کھوٹے کو منظرِ عام پر لے آتی ہیں۔ سید سلیمان صاحب نے ہزار صفحات میں بہت سا قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے اور بزرگوں اور خانوادوں کی ایک طویل تاریخ سمودی ہے۔ مگر حیاتِ شبلی کی یہی خوبی اس کا نقص بن گئی ہے۔ سوانح نگاری ایسی تمہیدوں کی متحمل نہیں ہو سکتی جو اس کے ہیرو کی شخصیت سے براہ راست متعلق نہ ہوں۔ ان طولانی تمہیدوں کی جگہ ایک دوسری کتاب میں تھی حیاتِ شبلی میں نہیں۔ دوسرے سر سید احمد خاں کی ذات اُن کی تحریک اور اُن کے متبعین کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں اختلاف کی بہت بڑی گنجائش ہے۔ اس کی تردید میں واقعات کی حیثیت سے بہت سے ثبوت پیش کیے جا سکتے

---

[1] شبلی نامہ از شیخ محمد اکرام

ہیں نیز فنی حیثیت سے سوانح نگار کو اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے طرفداری و مخالفت کے سیلاب میں بہنے کی اجازت نہیں ہے۔ حیاتِ شبلی کے مصنف عقیدت مندی کا دامن بہت مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی صاحب ایک قدیم مکتبہ خیال کے عالم جہاں شاگرد کا اُستاد سے اختلاف رائے کرنا کفر کے برابر ہے۔ حیاتِ شبلی اسی سعادت مندی اور فرماں برداری کا روشن مظہر ہے۔ مصنّف نے خود اس کا اعتراف کیا ہے اور کسی طرح کی مداخلت سے پرہیز کیا ہے۔ اس موقع پر دو حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

"اس حیاتِ شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ اس طرح اُستاد مرحوم کے احسانات کے بارے سبکدوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی۔ کیونکہ میری حقیر ذات پر اُن کے جو احسانات ہیں وہ کیف و کم کے احاطے سے باہر ہیں۔"

"مولانا کے سوانح میں بعض رفقاء کار اور معاصرین سے کچھ اُلجھاؤ بھی رہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے کسی موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے۔"

ظاہر ہے کہ سید صاحب نے جن پابندیوں کو اپنے سر لے لیا

ہے وہ انھیں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ حیاتِ شبلی شبلی کے کارناموں پر زیویو نہیں بلکہ اُن کی عظمت کا اعتراف ہے انھوں نے شبلی کو علی گڑھ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش ہے، بلکہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور خواجہ غلام الثقلین صاحب کو شبلی کی پیداوار بتایا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کو اس سے انکار ہے۔ حالات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ علی گڑھ نے علامہ شبلی کو شبلی بنا دیا۔ علی گڑھ کی خیال انگیز فضا میں جہاں مغربی اور مشرقی دونوں علوم کی فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں شبلی کے صحت افکار کی ضامن ہیں۔ مولانا حالی کی آمد و رفت جاری تھی اُن کی سائنٹفک اور جدید طرز کی تصانیف اور اُن کی صحبت سے بھی مولانا شبلی کو فائدہ پہنچا۔ سولہ سال سر سید کے ساتھ رہ کر شبلی نے علی گڑھ کی خدمت بھی کی اور اپنے ذہن کی تکمیل بھی۔ جس کا اقرار خود اُنھوں نے کیا ہے۔ اگر مولانا کی نگاہ میں علی گڑھ محض 'لال جھکڑوں' کی آماجگاہ تھا تو مثنوی صبح اُمید کس دل کی آواز تھی۔ اگر وہ علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو کیا ہوتے" یہ غور طلب امر ہے۔

سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کو واقعات کی ایک کھتونی بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس مولانا حالی نے ایک متوازن

اور منصفانہ انداز اختیار کر کے واقعات کے جنگل میں ضروری اور غیر ضروری واقعات کے انتخاب میں بڑے سلیقہ سے کام لیا ہے۔ حالی کا یہی سلیقہ سوانحی ادب میں آج بھی انوکھا ہے اس لئے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ حالی سے بہتر سوانح نگار اب تک اردو ادب میں پیدا نہیں ہوا۔

سرسیّد کا اثر
عہدِ جدید کے مُسلمانوں پر

سرسیّد احمد خاں کی مسلم دوستی اور اصلاحی خدمات کا اعتراف ہر شخص نے کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کی دستگیری کی جب اُن کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ ساری قوم پر بے بسی اور مایوسی طاری تھی اور انھیں کوئی ایسا راستہ دکھائی نہ دیتا تھا جس سے وہ اپنی تہذیب و تمدّن کی حفاظت کے ساتھ فارغ البالی اور عزّت کی زندگی بسر کر سکیں۔ تباہی اور بربادی کے اس بھنور میں وہ بہے جا رہے تھے اور ان پر عرصہ حیات تنگ تھا۔ ایک طرف انگریزوں کا عتاب دوسری طرف پڑوسیوں کی دشمنی، تیسری طرف خود اُن کی نااہلی۔ ایسی حالت میں کسی قوم کا زندہ رہنا اور پھر ترقی کی طرف قدم اُٹھانا ایک معجزے سے کم نہیں۔ یہ سرسیّد ہی کی ذات کی برکت ہے کہ مسلمان اس تباہی و بربادی سے جانبر ہو سکے۔ سرسیّد نے آئندہ کے امکانات

حال کی پستی کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا، اور ایک منصوبے کے تحت اس مرض کو دُور کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ ان کا یہی ارادہ سرسید تحریک کی صورت میں ظاہر ہوا، جس نے مسلمانوں کی تعلیمی، تمدنی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو نئے راستہ پر ڈال دیا۔ زندگی نے ایک نیا رُخ اختیار کیا اور اُمید کی ایک نئی کرن نمودار ہوئی۔

سرسید کے اس عظیم الشان کام کی مثال مسلمانوں کی صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کارنامے کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ہمیں اُنیسویں صدی کے مسلمانوں کی زندگی کی حالت کا جائزہ لینا ہوگا۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری، جاٹوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی چیرہ دستیوں نے ہندوستان کے سیاسی و اقتصادی زندگی کے ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اس انتشار کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر بہت خراب پڑا، وہ قوم جو صدیوں سے حاکم تھی اور اپنی بے شمار کمزوریوں کے باوجود ایسی ذہنی صلاحیتیں رکھتی تھی کہ صدیوں اس کا سکہ سرزمین ہند پر چلتا رہا۔ لیکن سیاسی انحطاط اور اخلاقی کمزوریوں نے ایسے تخریبی آثار پیدا کر دئے کہ انھیں نہ صرف سیاسی اقتدار کھونا پڑا بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی دیوالیہ ہو گئے۔ زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ ذہنی سکون کی خاطر

خیالی دنیا میں کھو کر رہ گئے۔ حالات کا جائزہ لینے اور اسباب و
علل پر غور کرنے کو اُنھوں نے غیر ضروری سمجھا۔ عمل کے پُجاری میدانِ
جنگ کے سورما اور تہذیب و تمدن کے خالق تقدیر کے آگے
بے بس ہو گئے اور اس انقلاب کے دھارے میں ایک حقیر تنکے کی
طرح بہہ گئے۔ اجتماعی احساس اور اس کی اہمیت کی اُنھیں
مطلق پروا نہ رہی۔ انفرادی جذبہ خود پرستی، بے جا غرور
کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اقتدار اُن سے رخصت ہو چکا تھا لیکن ابھی
تک اِس نشہ کا خمار باقی تھا، بدلتے ہوئے حالات کا اُنھیں قطعی
احساس نہ تھا۔ زمانہ کا انداز بدل چکا تھا۔ اس لئے پُرانے ہتھیار
بے کار ہو چکے تھے۔ انھیں نہ صرف دوبارہ جدوجہد کرنی تھی بلکہ
اپنے اندازِ فکر کو بھی بدلنا تھا۔ اب اُنھیں ایک بدیسی مگر انتہائی
منظم اور ترقی یافتہ قوم سے سابقہ پڑا تھا۔ جو تسخیر فطرت کے اصولوں
اور زندگی کے رموز سے گہری واقفیت رکھتی تھی اس لئے اُس کے
مقابلے میں جدید تصورات ہی کام دے سکتے تھے اور اُن کا مقابلہ
خود انھیں کے ہتھیاروں سے کیا جا سکتا تھا۔ بدیسی قوم کی یہی
فراست اور اعلیٰ تنظیم تھی جس کے سامنے مغلوں کا نظام کمزور
دیوار کی طرح بیٹھ گیا۔ مسلمانوں کو اس تبدیلی کا اس قدر صدمہ
ہوا کہ لوگ اس کے احساس سے ہی پریشان ہونے لگے۔ اور
رفتہ رفتہ یہ احساس ان کے دلوں سے بالکل نکل گیا۔ سرسید کا

بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس احساس کو دوبارہ پیدا کیا اور پھر اس کی مدد سے پوری قوم کی قوت عمل کو زندہ کیا۔ نئے حالات سے روشناس کیا اور وہ حالات پیدا کئے جن سے اس مرض کا علاج ہو سکے۔ اور مسلمان ایک باعزت زندگی بسر کر سکیں۔

مغرب کے اثر سے ترقی کی رفتار تیز ہو گئی، دوسری قوموں کو ترقی کرنے کا احساس زیادہ تھا، سرسید بھی اس احساس میں شدت پیدا کرنا چاہتے تھے، اس لئے اُن کی تحریروں میں ایک اضطرابی کیفیت نظر آتی ہے۔ اور اصلاحی رجحانات زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن کے اندر قومی برتری کے جذبات اور خوش حالی کی آرزوئیں بڑی شدت سے موجود تھیں۔ یہی شدید احساس انھیں انگریزوں کے قریب لے گیا۔ لیکن باوجود اس قدر اضطراب اور انہماک کے اُن کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین تھا اور اُن کا تہذیبی تصور حیات بخش اور جاندار تھا۔ وہ محض وقتی اصلاح کے حامی نہ تھے۔ بلکہ زندگی کا وسیع تصور رکھتے تھے۔ نظر کی یہی وسعت انھیں اپنے ماضی کی عظمت کا احساس دلاتی ہے اور بدلتے ہوئے حالات سے باخبر رکھتی ہے۔ سرسید کی تحریک میں اسلامی تہذیب کے صالح عناصر اور نئی تہذیب کے محاسن دونوں ملتے ہیں۔ لیکن تہذیب کا یہ صحیح امتزاج اُن کی قوم کو قبول نہ تھا ان کی زندگی لکیر کی فقیر تھی، جہاں ذرا سی تبدیلی بھی کفر تھی اور

دوسرے کی عظمت کو تسلیم کرنا سب سے بڑا شرک تھا۔ اس لئے سرسید کو شدید عصبیت اور قدامت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے اُن کے خواب کی تعبیر پوری طرح نہ نکل سکی اور ان کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا۔ انھیں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے بہت بڑے حصّہ کو خود اپنوں ہی کی مخالفت کی نذر کر دینا پڑا۔ بچا کچھا حصّہ تعمیری کاموں پر صرف ہو سکا۔

زوال یافتہ قومیں دوسروں سے سیکھنا اور کچھ حاصل کرنا اپنے وقار کے خلاف تصوّر کرتی ہیں اور آنکھ بند کرکے ایک راستے پر چلنا چاہتی ہیں اور نئی شاہراہوں پر قدم اٹھانے سے ہچکچاتی ہیں وہ بندھے ٹکے اصولوں کو پسند کرتی ہیں۔ اور زندگی کو ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں دیتیں۔ انیسویں صدی کے مسلمان اسی بے اعتمادی، کاہلی اور رجعت پرستی کے شکار تھے۔ یقین اور امید کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ "فتنہ طرازیٔ صیّاد سے" بالکل غافل تھے۔ اُن پر یہ مجہول اثرات اس قدر غالب تھے کہ اس کے نقوش اس دَور کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ جہاں زندگی کا مقصد محض تفریح کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ غرض کوئی ایسا پہلو نہ تھا جس میں روح کی آزادی کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا اور انسانیت اپنے صحیح مقام سے آشنا ہوتی۔ تہذیب کا یہ تصور اس قدر محدود تھا کہ اس پر کسی عظیم عمارت کی تعمیر ممکن نہ تھی

اس لئے ضرورت تھی کہ اس فاسد مواد کو نکال دیا جائے اور صحت بخش عناصر داخل کئے جائیں جو صحیح اسلامی تہذیب کے آئینہ دار ہوں ـــــــــ

زندگی ایک تغیر پذیر کیفیت کا نام ہے، جس میں ہر وقت اور ہر زمانے کے لحاظ سے نئے نئے تصورات ابھرتے اور جنم لیتے رہتے ہیں۔ کسی تہذیب کو اس وقت تک زندگی نہیں مل سکتی جب تک وہ زمانے کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتی رہے۔ تہذیب کیا ہے ؟ خود سرسید کے الفاظ میں اخلاق و عادات، معاشرتی طریق تمدن اور علوم و فنون کو بہ قدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی کھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے" سرسید کے اس تہذیبی تصور میں زندگی کا اعلیٰ نصب العین موجود ہے۔ یہ کسی کی نقالی نہیں بلکہ زندگی کے حقیقی مقاصد کے مطابق ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بار بار مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے اخلاق کو بلند کریں۔ اسلامی تہذیب کے وہ قدردان تھے لیکن اُن کی رائے میں مسلمانوں کی صدیوں کی غفلت نے اسے مکمل طور پر پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا اس لئے اسے وہ ناکافی سمجھتے ہوئے تہذیب عالم سے

استفادہ حاصل کرنے کے حق میں تھے۔ وہ ذہنی حد بندی کے مخالف تھے اور قطعیت کے قطعاً قائل نہ تھے۔ وہ نہ انگریزوں سے مرعوب تھے اور نہ اسلامی قدروں سے منحرف، بلکہ وہ کورانہ تقلید کی بندشیں ڈھیلی کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی معاشرت کے ساتھ دوسری اقوام کے تصورات زندگی پر بھی نظر رکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ رسم و رواج خواہ اپنے ہوں یا پرائے اُسے نیک و بد کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے تاکہ ترقی کے امکانات زیادہ سے زیادہ وسیع اور مستحکم ہو سکیں۔ مغربی اقوام کی مسلسل جدّ و جہد اور عزم و استقلال نے انھیں متوجہ کیا تھا اور انھوں نے ان کی بنائی ہوئی جنت کو خود دیکھا تھا۔ اُن کی فارغ البالی، تمدنی برتری اور بے پناہ علمی و تحقیقی ذوق نے انھیں متاثر کیا تھا۔ اور ایک منصف انسان کی طرح انھوں نے اِن بیش بہا خزانوں کی عظمت کو اپنے دل میں بٹھایا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کی قوم بھی ان نعمتوں سے متمتع ہو اور اپنے افلاس کو دور کرکے ایک اچھی زندگی بسر کرے اور اقوام عالم کی صف میں ستارہ کے مانند چمکے۔ انگریزوں کی کامیاب اور فارغ البالی زندگی نے انھیں متاثر ضرور کیا۔ اور یہ تاثر کہیں کہیں حد سے آگے نکل گیا ہے لیکن یہ ساری کیفیت اس دردمندی اور دل سوزی کی آئینہ دار ہے جو مسلمانوں کے لئے اُن کے دِل میں تھی بلاشبہ وہ چمک دمک سے زیادہ مرعوب ہوئے، اِس

کامیابی کے حقیقی راز تک نہ پہنچ سکے۔ انگریزوں نے ہندوستان اور دوسرے مقبوضات کی بہاروں کو لوٹ کر لندن کے بازاروں اور درسگاہوں کو رونق بخشی تھی۔ لیکن فتوحات کا یہ سلسلہ کسی تنظیم اور فراست کا نتیجہ ضرور تھا۔ سرسید اسی تنظیم اور بیداری شعور کے شیدائی تھے۔ انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک فتنۂ آشوب اور فتنۂ عالم ہوتے ہوئے بھی جدید تہذیبی ترقی کے خالق تھے۔ اس لئے سرسید کا انگریزی تہذیب کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے کا تصور کسی طرح غلط نہیں بلکہ مفید ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کے کون سے عناصر ہماری زندگی کے لئے مفید ہیں اور سرسید نے کس حد تک ان سے فائدہ اٹھایا۔ مشرق اور مغرب مزاج اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ مغرب کو مشرق سے آج تک وہ اُنسیت پیدا نہیں ہوئی ہے جیسے تہذیب نو میں عام طور پر بڑی اہمیت دی گئی ہے آج بھی مغربی قومیں مشرق کے خون سے اپنے گلستانوں کی آبیاری کرنا چاہتی ہیں، تاہم نفرت اور عداوت کی وہ شدت باقی نہیں رہی ہے جو جنگِ عظیم اوّل تک موجود تھی۔ لیکن مغرب کو مشرق کے اور زیادہ قریب آنا ہوگا۔ یہاں تک بندہ و آقا کا احساس باقی نہ رہے انسانیت کے نیک جذبات مغربی مفکروں کے یہاں ہیں۔ بعض

اشارے ہیں ایچ۔جی ویلز کی بعض تصانیف میں ملتے ہیں۔
اس لئے سرسید نے جس رہ و رسم آشنائی کی ابتدا کی تھی اس کی ضرورت کا احساس آج ہم زیادہ کر رہے ہیں۔ لیکن سرسید کا یہی میل جول اُن کی مخالفت کا باعث بھی تھا جس کو اہلِ ہند اور خاص کر مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور وہ اس نفرت میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ انگریزوں کا نامۂ اعمال بہت سیاہ تھا جنھیں کوئی قوم بھلا نہیں سکتی ہے۔ سرسید اس کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کے نزدیک ان مظالم کی روک تھام صلح و آشتی ہی میں ممکن تھی۔ نقطۂ نظر کا یہی فرق تھا جس نے مسلمانوں کو سرسید کا مخالف بنا دیا تھا۔ سرسید بھی انگریزوں کے کرو فر اور شاہانہ غرور کو پسند نہ کرتے تھے۔ مغربی اقوام سے بہت کچھ حاصل کرنے اور سیکھنے کا سلسلہ آج تک چلا آ رہا ہے اور آج ہم سرسید کی مصلحت کے قائل ہو رہے ہیں۔

اس وقت دنیا ایک ذہنی انقلاب کی طرف جا رہی ہے اور اس کی ابتدا ارضِ مغرب سے ہوئی ہے۔ اس لئے ہمارے اور اُن کے درمیان رشتہ کی ایک ایسی بنیاد پڑ چکی ہے جو اختلاف کے باوجود مٹ نہیں سکتی۔ دونوں گروہوں کو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور آج دنیا کی نجات زیادہ سے زیادہ اتحاد اور اتفاق ہی میں

ہے۔ مسلمانوں کو ایک بین الاقوامی اتحاد کی طرف سب سے پہلے سر سید ہی لے گئے تھے اور آج یہ ضرورت ناگزیر ہو گئی ہے ۔

اقبال نے پیام مشرق کے دیباچہ میں لکھا ہے:-

"اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ اور اس کا دھندلا سا خاکہ حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔"

یہ ذہنی انقلاب ارض مغرب سے شروع ہو کر دور دراز ممالک تک پھیل چکا ہے۔ آج دنیا ایک دوسرے کے نظریات و تحریکات سے متاثر ہو رہی ہے۔ کوئی قوم اپنی تہذیب، زبان، ادب اور سیاست کو علیحدگی کی بنیاد پر زندہ نہیں رکھ سکتی۔ اسے تو اقوام عالم کے دوش بدوش چلنا ہو گا۔ مشرق کو مغرب سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن مغرب کو بھی مشرق کے حالات و نظریات کا ہمدردی سے مطالعہ کرنا ہو گا۔ اور اُن کی تہذیب و روایات کا احترام کرنا پڑے گا ورنہ جس نئے آدم اور نئی دنیا کی تعمیر کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا وہ وجود میں نہ آسکے گی۔ مشہور دانشور

پروفیسر (Whitehead) نے اپنی کتاب Science and the Modern World میں ایک جگہ لکھا ہے:-

"The wisemen of The East Have been Puzzling, as to what May be the Regulative Secret of Life Which can be Passed From West to East Without the Wanton Destruction of their Own Inheritance Which they So Rightly Prize. More and More it is Becomig Evident that What the West can Most Readily Give to the East is its Science and its Scientific Outlook. this is Transferadle From Country to Country and From Race to Race Wherever there is a Rational Socity"

ہمیں اپنی عملی زندگی کو توانا اور صحت مند بنانے کے لیے مغرب کی زندگی سے سائنس اور دوسرے علوم کو حاصل کرنا ہوگا لیکن اپنے اخلاق و مذہب کو ضروری نہیں ہے کہ مغرب کی تقلید میں تج دیا جائے ارض مغرب نے مذہب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش محض اس وجہ سے کی تھی کہ وہ کلیسا کے استبداد اور اس کی سازشوں

سے تنگ آچکی تھی۔ اور عیسائی مذہب انسانی ترقی میں معاون ہونے کے بجائے اُس کی راہ میں سنگِ گراں بنا ہوا تھا اس کے برعکس اسلام ضابطہ حیات ہے اور زندگی کے لئے دستور العمل ۔ اگر اس کا صحیح اور مناسب استعمال کیا جائے تو وہ ہمیں نہ صرف بے راہ روی سے بچائے گا بلکہ انسانی فلاح و بہبود کا وہ جذبہ عطا کرے گا جو اب تک دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ابھر سکا ہے ۔ یورپ کے مذہبی پیشواؤں کے سر پر ہوس اور اقتدار کا جو بھوت مسلط تھا اُس نے انھیں لالچی اور ابن الوقت بنا دیا تھا اور وہ ہمیشہ اسی مقصد پر نظر رکھتے تھے۔

ہندوستان کے دورِ شہنشاہیت میں جہاں کچھ مذہبی علماء بادشاہوں کے دستِ نگر بن گئے تھے وہاں علماء صلحاء اور صوفیائے کرام کا ایک بڑا گروہ ایسا بھی تھا جو عوام کی پشت پناہی کرتا اور جابر سلاطین کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہتا تھا۔ اس لئے ایشیائی شہنشاہ مذہبی گروہ کی تائید سے اپنا کام تو نکالتے رہے لیکن بحیثیت مجموعی اس طبقہ کی حریت فکر کو ختم نہ کر سکے ۔ اس لئے مذہب کے معاملے میں ہمارا طریق کار یورپ سے بالکل جُدا ہے ، ہو سکتا ہے کہ عیسائی مذہب اُن کے لئے مصیبت بن گیا ہو لیکن ہمارے لئے اسلام رحمت ہے ۔ اسلام کی اساس انسان دوستی اور فلاح پر

ہے۔ اس کی مدد سے ایک مثالی معاشرہ کو جنم دینے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کی تنظیم سے انسانی زندگی اور اخلاق کا معیار بلند کیا جائے۔

سرسید کی تحریک میں مذہب کی اصلی روح سے کسی جگہ بھی بغاوت نہیں ملتی البتہ روایتی مذہب کی مخالفت کی گئی ہے۔ انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر میں بعض جگہ جو تاویلیں کی ہیں وہ ایک ردِ عمل کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی انھوں نے اسلام کو دینِ فطرت ثابت کر کے زندگی سے اس کا جو رشتہ واضح کیا ہے اُسے آج ہر مکتبہ خیال کے لوگوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ مولانا حالیؔ نے ٹھیک لکھا ہے کہ اُن کے تمام کارناموں کی بنیاد مذہبی جذبہ پر تھی جس سے انھوں نے ضبط، اعتدال، اجتماعی احساس، قوتِ عمل کا سبق سیکھا تھا اور انھیں قدروں کو زمانے کے مطابق زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کی۔ ناسازگار حالات ہونے کی وجہ سے سرسید اور اُن کے رفقاء کار کے یہاں مصلحت وقت سلسلہ ضرور شروع ہو گیا لیکن ایک وقتی جذبہ کے ماتحت ایسا ہوا اسے یہ حضرات کوئی مستقل قدر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ سرسید نے جدید تصورات تک رسائی انگریزوں کے ذریعہ حاصل کی تھی اور انگریز قوم جذبات و خیالات سے زیادہ عمل اور ارادے کی پابند ہے۔ وہ ضروریاتِ زندگی پر زیادہ زور دیتے

ہیں۔ روایات کے پرستار ضرور ہیں، لیکن تجربات کی اہمیت سے بھی غافل نہیں ہیں۔ کوئی تجربہ نیا نہیں ہوتا بلکہ وہ پچھلی روایات کی ایک ترقی یافتہ شکل ہوا کرتا ہے۔ جیسے 'لذتِ تجدید' جوانی عطا کرتی ہے۔ جذبات و احساسات کے حیرت انگیز کارنامے انجام دینے کے باوجود ان کے یہاں عمل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے انگریز قوم ہر سخن موقع اور ہر نکتہ کی مناسبت کا بڑا خوشگوار احساس رکھتی ہے۔ سرسید نے اس انداز کو بہت سراہا ہے اور مسلمانوں میں اس خیال کو عام کرنے کی ہر جگہ کوشش کی ہے

سرسید کے خیالات کی اشاعت ان کی زندگی کے بعد باقاعدہ جاری نہ رہ سکی۔ ان کی کوششوں کا ثمرہ جو علی گڑھ کالج کی صورت میں باقی تھا۔ وہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کا مرکز قرار پایا ہے۔ سرسید نے جدید تعلیم کو ذہنی تربیت کے ماتحت رواج دیا تھا اور تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا کہ مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں۔ تعلیم کا مقصد محض 'ڈپٹی کلکٹری' حاصل کرنا نہیں قومی اخلاق کی اصلاح اور تلاش تحقیق کا مادہ پیدا کرنا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے صفحات پر جابجا ذہنی تکمیل شعور کی پختگی خوداعتمادی اور حقیقی علم وفضل کا شوق پیدا کرنے کا ذکر ملتا ہے

[illegible]

کیا کرنا چاہیئے۔ اس وقت تک ان میں نہ حشمت ہوگی، نہ دولت، نہ منزلت اور نہ تہذیب، لیکن افسوس ہے کہ اُن کے بعد کچھ نوحالات کی مجبوریوں نے اور کچھ رہبرانِ قوم کی غفلت نے تعلیم کو تجارت بنا دیا۔ تہذیب اور ترقی کا جو مقصد سرسید نے سمجھا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ بقول آلِ احمد سرور "علی گڑھ کی ساری اچھی روایات ایم۔اے۔او کالج کی عطا کردہ ہیں۔ یونیورسٹی ان میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ کر سکی" قومی ضرورتوں سے زیادہ سرکاری ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ اس طرح وقتی مصلحتوں کے دھارے میں حقیقی مقاصد بہ گئے۔ اس غلط رجحان پر اکبر نے بڑی خوبی سے طنز کیا ہے۔

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے پنشن ہوئی اور مر گئے

بی۔اے ہونا اور نوکری میں عمر گزار دینا زندگی کا بڑا مقصد نہیں ہے، بلکہ ایک سطحی اندازِ فکر اور رکھو کھلا نظریہ ہے جس سے نہ قومی وقار بلند ہوتا ہے اور نہ زندگی کی رہنمائی اور انسانیت کی فلاح کا فرض انجام پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری قومی زندگی اور طریقۂ تعلیم میں وہ وزن اور وقار نہیں ہے جس سے تسخیرِ فطرت کے نئے اُصول اپنانے اور ایک بلند منزل تک پہنچنے کا شعور پیدا ہو۔ موجودہ دور سیاسی شعور اور تہذیبی تصورات کا دور ہے۔

ضرورت ہے کہ ہماری زندگی میں صحت مند
رجحانات تیزی سے بڑھیں اور ہم فطرت کے تقاضوں اور نئے
دور کی تہذیبی برکتوں کو سمجھ سکیں۔ آج ہمیں پہلے سے زیادہ
علم و فن کی پرستش کام کرنے کی لگن اور ایک نئے احساسات
و گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس لئے ذہن کی بیداری
حقیقت کی تلاش کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے ہمیں سرسید
کے خلوص اُن کے جذبۂ ایثار اور مسلسل جدّ و جہد کو
اپنانا ہوگا۔

بحیثیت مجموعی سرسید کا تہذیبی کارنامہ اس قدر
عظیم الشان ہے کہ کسی دَور میں بھی اِس سے چشم پوشی نہیں
کی جا سکتی۔ آج مسلمانوں میں جو بیداری اور روشن خیالی
نظر آتی ہے وہ اسی ایک پیرِ مرد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

سرسید نے زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے کا جو سبق
دیا تھا لوگوں نے اس کے محدود معنی لئے اور فارغ البالی
سے مراد محض جاہ طلبی اور انفرادی خوش حالی سمجھے یہ انفرادی
کامیابی کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ لیکن تہذیبی ترقی کی آخری
منزل بھی نہیں بلکہ اجتماعی فلاح تک پہنچنے کے لئے محض نشان
راہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نشان کی مدد سے قدم آگے بڑھائے
جائیں اور سرسید نے جس ذہنی بیداری کے عام کرنے کا مشکل کام

شروع کیا تھا اس کی تکمیل میں انتھک کوشش کی جائے۔ یہی عمل پیہم اور جذبۂ ایثار سرسید کا سب سے بڑا ورثہ ہے۔ جس سے کام لے کر انھوں نے علم و عمل کی ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشنی ہمیشہ رہبری کرتی رہے گی۔

"ترقی پسند ادب" پر ایک نظر

سردار جعفری نے اپنی اس کتاب میں ترقی پسند تحریک کی رفتار کا جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ ترقی پسند تحریک کی باقاعدہ تنظیم ۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی ہے لیکن اس سے پہلے اُردو ادب ترقی پسند رجحانات سے خالی نہیں تھا۔ حالی، شبلی، اقبال اور پریم چند نے ماضی کی بہت سی فرسودہ روایات کو توڑ کر اُردو ادب کو ترقی پسند رجحانات سے آشنا کیا۔ ۱۹۳۶ء سے اس تحریک نے نشیب و فراز کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ اس عرصہ میں کبھی اُس نے اپنے کو محض اشتراکیت کے پرچار تک محدود رکھا۔ کبھی جنسی رجحانات کا غلبہ ہوا اور کسی دور میں ماضی سے نفرت اور بزرگوں کے ورثہ سے انحراف کیا۔ کبھی اقتصادی اُلجھنوں میں ہی اُلجھ کر رہ گئی لیکن اس افراتفری کے دلدل سے اب یہ تحریک بہت کچھ نکل آئی ہے اور اس کے اثرات عام ہو رہے ہیں۔

---

۱ ترقی پسند ادب، مصنفہ علی سردار جعفری مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ

جن نقادوں نے اس تحریک کو خس و خاشاک سے پاک وصاف کیا ہے ان میں مجنوں گورکھپوری اور احتشام حسین کا نام بہت نمایاں ہے۔ اگرچہ پہلی باقاعدہ آواز اختر حسین رائے پوری نے اٹھائی تھی لیکن اُن کا نقطۂ نظر بہت شدید اور انتہا پسندی پر مبنی تھا۔ اس لئے ادب اور انقلاب کی افادیت زیادہ نہ ہو سکی وہ ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہے دوسری کتاب عزیز احمد کی ہے۔ لیکن یہ کتاب قدرے مختصر ہے تاہم اس کے متوازن نقطۂ نظر سے انکار نہیں کیا جا سکتا مغربی ادب کے مطالعہ کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں اور اسی روشنی میں ایک سائنٹفک نقطۂ نظر تک پہنچنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے۔ ترقی پسند تحریک پر تیسری باضابطہ تنقید سردار جعفری کی ہے اُن کا نقطۂ نظر اشتراکی ہے اور تمام تر تجزیہ اشتراکیت کے ہی محور پر گھومتا ہے۔ لیکن اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اشتراکیت کے فلسفہ کو ادبی روایات اور تجربات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ یہ بحیثیت مجموعی اُن کا نقطۂ نظر کسی قدر اعتدال کی طرف مائل ہے۔ جعفری صاحب اشتراکیت کے راستے سے بنی نوع انسان کی تکالیف اور سماجی کشمکش کا علاج تلاش کرنے میں منہمک ہیں، لیکن اُن کا ذہن ابھی اس وسیع حلقہ میں داخل نہیں ہو سکا ہے جہاں ہر اچھی چیز کی قدر کی جاتی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت ایک ہی تحریک کے دو نام ہیں۔ ترقی پسند اشتراکیت کے اصولوں کو ادبی تخلیقات کا روپ دے کر اس کی تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں۔ اس لیئے اس عالمگیر تحریک کی طرف سے بدگمانی عام ہو گئی ہے اور یہ تعصب اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ایک نسل ہر نئی چیز کو نظر انداز کرنا چاہتی ہے۔ گویا یہ ایک منحوس سایہ ہے جس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن کچھ سنجیدہ اہل قلم ضرور ہیں جنھوں نے غور و فکر کی زحمت گوارا کی۔ اور ترقی پسند تحریک کو سہارا دیا۔ اور ماضی کی روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ نئے تجربوں کو بھی سراہا۔

دنیا ایک تجربہ گاہ ہے جہاں زندگی ہر وقت کروٹ بدلتی رہتی ہے۔ بہت سی پرانی باتیں ختم ہو جاتی ہیں، نئی چیزیں وجود میں آجاتی ہیں۔ قدیم تہذیبی قدریں نیا روپ اختیار کرتی ہیں اور نئے پرانے کے امتزاج سے ایک حسین پیکر کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ لیکن دنیا کی نہ ہر پرانی چیز بےکار ہے اور نہ ہر نئی چیز اچھی۔ بلکہ پرانی چیزیں اور نئی چیزیں بیک وقت ہمارے لئے مفید ہیں۔ زمانے کا ہاتھ بڑا سخت ہے کوئی ایسی چیز جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی خود بخود مر جاتی ہے اور زندہ وہی چیزیں رہتی ہیں جن میں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا

ہے۔ ترقی پسند تحریک بھی ایک تجربہ ہے جس نے ماضی کی روایات کے سہارے اپنے کارناموں کو آگے بڑھایا۔ اگلوں کے کارناموں کی قدر کی لیکن اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ناکافی سمجھ کر آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اس راہ میں جہاں بھی توہمات، تنگ نظری، جہل اور قدامت کے پتھر سامنے آئے انھیں ہٹا دیا یہی دنیا میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ اور یہی ہوتا رہے گا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ترقی پسند تحریک پر اشتراکی غلبہ ہونے کے باوجود اس نے زندگی کے ہر گوشہ پر ایک زاویہ نگاہ سے نظر ڈالی اور ادب میں زندگی کی وسعتوں کو سمیٹ کر اسے زندہ جاوید اور وقت کی سب سے مؤثر آواز بنا دیا۔ ادب صرف حسن و عشق کا پجاری نہیں رہا بلکہ اس کے وسیع دامن میں سماجی مسائل طبقاتی کشمکش اور معاشرتی اُلجھنیں بھی سمٹ آئیں۔ جو ادب ان مسائل کو اپنا موضوع بنائے گا وہی ترقی پسند ہوگا جو وقت کے تقاضوں اور ماضی کی روایات کے تانے بانے سے تیار ہوگا۔ اسی کو ادبیت حاصل ہوگی خواہ یہ تجربات کسی منظم شکل میں کئے جائیں۔ خواہ انفرادی طور پر بہرحال ادب سے "اس کا سماجی کردار" نہیں چھینا جا سکتا۔ یہی سماجی کردار اقبال کی ہمہ گیر شاعری، جوش کی بلند آہنگی اور پریم چند کی انسان دوستی کا طرۂ امتیاز ہے لیکن یہ فنی کارنامے کسی تحریک کے سایۂ عاطفت کے رہین منت نہیں ہیں۔ کسی چیز کو منظم شکل دینا بذاتِ خود بہت

اچھی چیز ہے لیکن اس میں اختلاف رائے کی گنجائش نہ ہونا اس کے لئے پیغام موت ہے۔ جیسا کہ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ "اختلاف صرف انجمن کے اغراض و مقاصد کے دائرے کے اندر ہی رہ کر ہی ممکن ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی سخت پابندی ہے اچھے اور صحت مند ادب کی تخلیق کے لئے کسی جماعت کی ممبری قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس سے باہر رہ کر بھی ادب میں انسان دوستی کے جذبات و خیالات الفاظ کا جامہ پہن سکتے ہیں لیکن شعور کے احساس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیئے گویا جماعت کے باہر بھی شعور کے دائرہ میں رہ کر صحت مند ادب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے تمام ادیبوں کو انسانی فلاح و بہبود کی خاطر ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیئے خواہ وہ کسی جماعت کا ممبر بن کر یا اس سے باہر رہ کر۔ بہرحال ادب سماجی ماحول کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔

کتاب کی ابتدا میں ایک عنوان حرف اوّل کا ہے جس میں مصنف نے بعض ابتدائی باتیں بتائی ہیں۔ اس کے بعد اعلان نامہ ہے۔ یہیں سے تحریک کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ اعلان نامہ وہی ہے جو یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں منظور ہوا تھا جس میں ادب کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرنے کے مترادف بتایا گیا تھا۔ اس اعلان نامہ کے فوراً بعد نقطۂ نگاہ کی وضاحت کا سلسلہ شروع ہوتا

ہے اور ادب کی افادیت اور مقصدیت کی طرف اشارے ملتے ہیں اس باب میں ٹیگور کے خط کا حوالہ ہے جو انھوں نے ترقی پسند مصنفین کے نام لکھا ہے جس میں ٹیگور کے نقطہ نظر میں بڑی تبدیلی ملتی ہے "اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام و نامراد رہے گا"۔

اگرچہ ٹیگور روحانی نشاتی میں دنیا کے کرب کا علاج ڈھونڈتے رہے۔ مگر انھوں نے سماجی شعور کو ایک اٹل حقیقت مانا ہے، بلاشبہ سماجی شعور ایک حقیقت ہے۔ ادیب زندگی اور ماحول سے ہی مواد حاصل کرتا ہے لیکن یہی مواد ذاتی تجربات اور شخصیت میں تحلیل ہو کر خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن کر ادب بنتا ہے۔ یہ خوبصورت پیکر سماجی ماحول اور ادیب کے خون جگر سے تیار ہوتا ہے۔ اس لئے ادب زندگی اور ماحول کا عکس ہوتے ہوئے بھی انفرادی صلاحیتوں کا رہین منت ہوتا ہے۔ فن کار کی انفرادیت سب کچھ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا ادیب کے لئے سماجی کردار اور اس کا فن دونوں ضروری ہیں یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے اور نہ زندگی کی دھڑکنوں سے علیحدہ ادب کے کوئی معنی ہیں۔ ادیب کبھی اسرار حیات کے انکشافات کرتا ہے کبھی پیکان حیات کے لئے راہیں تلاش کرتا ہے اور کبھی ستاروں کی گزرگاہوں میں سرگرداں ہوتا ہے اور کبھی سرو رواں اور گلستانوں میں نغمہ خوانی کرتا ہے۔

کبھی کتابِ دل کی تفسیر لکھتا ہے اور کبھی محبوب کی انگڑائیوں پر دل نثار کرتا ہے غرض ادیب کی زندگی۔ عوام کی زندگی کے پیچ وخم اور جذبات وافکار سے ہم آہنگ ہوتی ہے، اس سے علیحدہ ہو کر نہ خود باقی رہ سکتا ہے اور نہ اس کا فن ابدی زندگی حاصل کرسکتا ہے۔ لطافت احساس اور زندہ رہنے کی اُمنگ دونوں چیزیں انسانی جذبات سے متعلق ہیں اور دونوں کے حسین امتزاج سے ادب میں توانائی اور حُسن پیدا ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک زندگی کے نشیب وفراز سے اپنی شخصیت بناتی ہے اور ذوقِ یقین سے اُسے سنوارتی ہے وہ اس بات کی مدعی ہے کہ اُس نے ادب کو فرسودگی اور رُجعت پرستی کے خوفناک طلسم سے نکال کر اسے حیات بخش رجحانات سے معمور کردیا اور اسے ایک ایسی شاہراہ پر ڈال دیا جہاں سے زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ عزیز احمد کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک کوئی نئی چیز نہیں بلکہ قدیم رجحانات کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے البتہ اس تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اردو ادب میں آسکر وائلڈ کے اثرات کے ماتحت پیدا ہونے والے بعض نظریات کا خاتمہ کردیا۔ نیاز فتحپوری نے علم الاصنام کا جو شیش محل تیار کیا تھا اسے چور چور کردیا اور نیاز کے ذخیرہ ادب برائے حسن کو کھوکھلا کر ڈالا اور لکھنوی کی انحطاطی شاعری اور جرکین جان صاحب

کے خرافات کے زہریلے اثرات کو ختم کر دیا۔ انسان کے شعور کو اور زیادہ پختہ اور صحت مند بنایا یا ادب اور زندگی کے رشتہ کو اور زیادہ مضبوط کیا۔ ماضی پرستی اور ماضی کے احساس میں فرق کیا۔ ادب کی دنیا کو وسیع کیا۔ صحیح معنوں میں ادب کو زندگی کی تنگ دو سے آشنا کر دیا۔ فن اور اصناف میں نئے نئے تجربے کئے اور اپنی انقلابی فکر سے دنیا میں ہلچل مچا دی اور سردار جعفری کے الفاظ میں واضح کر دیا کہ:۔

" آرٹ جادو تھا جس کا مقصد فطرت اور ماحول کو تبدیل کر کے انسان کے لئے بہتر زندگی اور بہتر سماج کی تشکیل کرنا تھا۔ آرٹ آج بھی یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔ فطرت وسماج اور انسان کے درمیان جو تضاد ہے اس کو خوشگوار شکل میں حل کرتا ہے۔ اس لئے آرٹ کے لئے آج بھی سحر کاری سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔ جس آرٹ اور ادب میں تاثیر نہیں وہ دو کوڑی کا ہے۔" یہ تاثیر فن کار کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہے۔ اقبال کے یہاں جو عظمت اور بلندی آئی ہے وہ فکر کی گہرائی اور روایات کے گہرے احساس کا نتیجہ ہے۔ ایڈمنڈ اسٹول نے لکھا ہے کہ

" ایک بڑا شاعر بہرحال ایک روایت پرست بھی ہوتا ہے اور تجرباتی بھی۔" بقول ایک نقاد کا ڈویل جیسا اشتراکی نقاد بھی کلاسکی ادب کی اہمیت کو نظر انداز نہ کر سکا۔ سردار جعفری کے

یہاں یہ احساس مشروط ہے۔ وہ آرٹ کو فرد کی دسترس میں سمجھتے ہوئے بھی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ "سچی تخلیق صرف جماعت کر سکتی ہے۔" جماعت کی قوت تسلیم لیکن اس میں وقار فرد کے سوز و گداز ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جس قدر عظیم الشان تخلیقی کارنامے وجود میں آئے ہیں کسی جماعت کے رہین منت نہیں پھر بھی ان میں زندگی کی لہک اور اُمنگ موجود ہے۔ آل احمد سرور نے اس عقدہ کا حل یوں کیا ہے: "ہمیں انفرادیت کی قدر کرنی ہے اور انفرادیت کو اجتماعی احساس دلانا ہے۔" یہ حقیقت ہے کہ فنکار کی تخلیق خارجی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن فرد کی انفرادیت ان حالات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر زندگی عطا کرتی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب بنیادی مسائل سے متعلق ہے۔ اس میں عوامی ادب، مزدوروں کے جلسے، مزدور شاعر کی ذمہ داری اور اس کی مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ادیب کو مزدوروں سے براہِ راست رابطہ پیدا کرنے کا نیک مشورہ شامل ہے۔ تاکہ انسانی زندگی کے تمام پہلو ہمارے ادبی کردار میں سما سکیں۔ اردو ادب میں یہ خیالی طوطا مینا اُڑانے کا مشغلہ بہت عام رہ چکا ہے لیکن یہ حقیقت کی تلاش اور حقیقی زندگی کا مطالعہ کرنے کا ذوق کوئی نئی چیز نہیں۔ حالی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں مشاہدۂ فطرت

اور مطالعہ کائنات کی اہمیت پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ عوام کی نفسیاتی زندگی معاشرتی حالت اور خانگی درد انگیز کیفیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اُن سے براہ راست تعلق پیدا کیا جائے۔ رشید احمد صدیقی کے پٹوارجی اور ستھانیدار جیسے مضامین جس قدر حقیقی اور جیتے جاگتے ہیں اُن کے دوسرے مضامین ویسے نہیں۔ اس کی وجہ رشید صاحب کی وہ براہ راست معلومات ہیں جو انھیں کچہری میں رہ کر حاصل ہوئیں۔ جعفری نے ٹھیک لکھا ہے کہ مزدوروں سے رابطہ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے احسان دانش (شاعر مزدور) کے یہاں مزدوروں کے خدوخال نہیں ابھر سکے۔ لیکن اس میں فن سے بھی کسی قدر ناآشنائی کو دخل ہے شاعری کا ظاہری رُوپ بغیر بادۂ وساغر کے نہیں نکھرتا۔ مجروح کا یہ شعر مزدوروں کے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اچھا شعر ہے:۔

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

ادب میں سادگی اور صفائی کی اہمیت ہے۔ شاعری کو ابہام سے دور ہونا چاہیئے۔ لیکن اس میں جان اور تازگی اچھی تشبیہات اور حسنِ الفاظ ہی سے آتی ہے اور سادگی کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے لیکن شاعری 'آبلہ پایانِ شوق' کو نظرانداز کرکے زندہ نہیں رہ سکتی "شاعری بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کا

نام ہے "شاعری کا جادو حسنِ الفاظ کا رہینِ منت ہے۔ جعفری کو خود بھی اس کا احساس ہے فراق کے امریکی بنجارہ نامہ پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ" جنتا کے لئے شاعری کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ شاعری کے لوازمات کو بالائے طاق رکھ دیا جائے " یہ صحیح ہے کہ تشبیہہ و استعارے تو عوام کی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔ بحروں کی بنیاد موسیقی اور موسیقی کی بنیاد سماجی زندگی کے ترنم اور آہنگ پر ہے۔ اس لئے روایت کی اہمیت سے انکار کرنا بے معنی بات ہے۔ ہر ادیب کو انسانیت۔ خلوص۔ ہمدردی۔ سماجی ماحول اور ماضی کی روایات کے سہارے آگے بڑھنا ہوگا۔ میر، غالب، ٹیگور اور اقبال کے فنی کارناموں کی مدد سے ادب کو آگے بڑھانا ہوگا۔

تیسرے باب میں اُردو ادب کا تاریخی پس منظر ہے۔ یہاں سرسید، حالی، شبلی، اقبال اور پریم چند کی ادبی حقیقت پر بحث کی گئی ہے جو صحیح معنوں میں ترقی پسند ادب کے علمبردار ہیں جن کی جرأت رندانہ اور ذہنی کاوشوں نے ادب کو تنزل اور انحطاط کے غار سے نکال کر صحت مند رجحانات سے آشنا کیا اور اُردو ادب میں زندگی کی جولانیاں پیدا کیں۔ ابدی قدروں سے اس کی وسعت اور زندگی میں اضافہ کیا۔ اور اسے زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کیا سرسید اردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے موضوع اور

لوب دونوں میں نمایاں تبدیلیاں کیں اور ادب کو ایک مقصدی
لک دیا اسے زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ حالی نے ان
متوں کو اور مضبوط کیا اور جس عمارت کی پہلی اینٹ سرسید کے
ندس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ حالی نے اسے مکمل کیا۔ سرسید کا
مانہ بڑی الجھنوں کا زمانہ تھا۔ ہر طرف انتشار قدامت پرستی
الت اور تعصب عام تھا۔ زندگی کے تقاضے کچھ اور تھے۔ لوگ
سری طرف جا رہے تھے۔ اس افراتفری کے زمانے میں علم و
ل میں یکسوئی پیدا کرنا صرف سرسید کا کام تھا۔ اس مشکل کام
ں انھیں مصلحتوں سے بھی کام لینا پڑا۔ کبھی دب کر صلح کی۔
ہاں تک کہ انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑا۔ سردار
عفری نے سرسید کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، ان پر مغرب
ستی کا الزام لگایا ہے۔ یہ الزام سراسر غلط ہے۔ مولانا ابوالکلام
زاد نے بھی سرسید کی پالیسی کو سربسجود کی پالیسی بتایا ہے۔ یہ
قطہ نظر انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ سرسید مغرب پرست نہ تھے
مجبوراً مغرب دوست ضرور بن گئے تھے۔ سرسید وہ پہلے شخص
ں جنھوں نے مسلمانوں میں قومیت کا بیج بویا، جس
ندہ قومیت کا خواب جعفری صاحب دیکھ رہے ہیں وہ شاید ہی
ھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ شبلی کی انگریز دشمنی کسی ٹھوس حقائق پر
نی نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا ردعمل تھا جو جذبات کی شدت اور

مذہبیت کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ غرض سرسید کے نورانی دماغ سے جو شعاعیں پھوٹیں اس نے اس دور کی تاریکی کو بہت کچھ چھانٹ دیا۔ سرسید کی اصلاحی تحریکات نے سماج۔ ادب۔ معاشرت۔ مذہب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس انقلاب کی لہر کو حالی نے اپنی ادبی صلاحیتوں کے ذریعے ایک مستقل دریا کی صورت بخشی اور ادب کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔

اقبال بھی سرسید۔ حالی اور شبلی کی تحریکات کی سب سے مضبوط کڑی ہیں۔ یہ بیسویں صدی کی بہت بڑی ادبی شخصیت ہے شخصیت بڑی بھرپور اور جامع ہے۔ اقبال کی شاعری بعض مخصوص تصورات کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اور پھیلتے پھیلتے ایک فلسفۂ زندگی اور نظام حیات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ مخصوص فلسفہ حیات اسلام کا عالمگیر نظام اور مساوات پر مبنی ہے۔ جو توہمات رجعت پرستی اور مزاج خانقہی سے بیگانہ ہو کر وسعت افلاک میں سیر کرتا ہے۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

اقبال اسلامی طریق زندگی پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اشتراکیت کے خلاف ہیں۔ جعفری صاحب اشتراکی ہیں اس لئے وہ اقبال پر تنقید کرتے وقت ذاتی تاثرات سے کام لیتے ہیں۔

اُن کے خیال میں اقبال کا پیام بڑا تھا۔ چونکہ وہ بعض روحانی قدروں سے آلودہ ہے اس لئے اُس کی عظمت محدود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں جعفری صاحب کے دل اور دماغ میں کشمکش جاری ہے۔ اُن کا دماغ انھیں اشتراکیت کی طرف لے جاتا ہے اور دل اقبال کی عظمت پر گواہی دیتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سردار صاحب پہلے ترقی پسند نقاد ہیں جنھوں نے اقبال کی عظیم شاعری کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ اپنایا ہے۔ اُن کے خیالات پر اقبال کا غیر معمولی اثر ہے۔ جعفری صاحب کی وسعتِ نظر انھیں اختر حسین رائے پوری بننے سے روکتی ہے اور وہ مادیت مادیت کے فلسفہ پر ایمان رکھنے کے باوجود اقبال کی روحانیت سے اختلاف تو کرتے ہیں نفرت نہیں کرتے ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ اقبال کا پیام بڑا تھا۔ لیکن اپنے عہد کے اُلجھاؤ سے آزاد نہ ہوسکا۔" یہ ایک طرح سے اقبال کی عظمت کا دلی زبان سے اعتراف ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال کے فلسفۂ خودی پر عینیت کا غلبہ زیادہ ہے اور اُن کی شاعری میں شعور ایک رومانی اور خیالی طلسم میں گھر کر حقیقت سے دُور جا پڑتا ہے۔ اسی طرح کا خیال ن۔م۔ راشد کو بھی پریشان کر رہا ہے۔

جہاں غریب کو نانِ جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کہیئے

حالانکہ درسِ خودی یا عزت روٹی کمانے کا ذریعہ ہے۔
عزیز احمد نے 'اقبال، نئی تشکیل' میں اس کی تصریح کی ہے۔ عام طور پر ترقی پسند نقاد اقبال پر تنقید کرتے وقت بھٹک جاتے ہیں اور پسند یا ناپسند کی تلاش ان میں توازن باقی نہیں رہنے دیتی۔ سردار جعفری بھی اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ لیکن اقبال کی عظمت قدم قدم پر انھیں مسحور کرتی ہے اور اُن کا لہجہ بدلتا رہتا ہے۔ "اگر کسی نے سماجی حالات اور ماحول سے الگ ہو کر اس خودی کا صرف تصوراتی تجزیہ شروع کر دیا تو اقبال کا کچھ نہیں بگڑے گا خود نقاد بھٹک جائے گا اور اپنی تنقید کی بھول بھلیاں میں گم ہو جائے گا۔"

اشتراکیت کا بنیادی نقطۂ خیال یہ ہے کہ ایک ایسی غیر طبقاتی سوسائٹی کو جنم دیا جائے جو باہمی منافرت اور اونچ نیچ سے بالا ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ مذاہب کی شریعتوں سے نجات حاصل کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے نام پر انسانیت کا گلا گھونٹا گیا اور تمیز بندہ و آقا کر کے آدمیت کے درمیان فساد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن مذاہب کی روح ہمیشہ انسانیت کے ساتھ ہی سانس لیتی رہی ہے۔ خاص کر اسلام کی زندگی میں وہ مستی کردار ہے جو مسکینی و محکومی اور نا امیدی سے روکتی ہے۔ ساری دنیا کو اخوت کی دعوت دیتی ہے ور تمیز بندہ و آقا کو جائز تصور نہیں کرتی اور جلال و جمال کی آمیزش سے دنیا کو توازن بخشتی ہے۔

—— جعفری صاحب کی یہ خواہش ہے کہ شاعری دل کو نئے مقاصد کے لئے تیار کرتی ہے "ہندوستان میں بہ صدا صحیح معنوں میں صرف اقبال کی شاعری میں سُنائی دیتی ہے وہ ایک نسل کے خالق ہیں جو عدل و مساوات رنگ و نسل سے بے نیاز انسانیت کے صحیح احساس وشعور کی چنگاریاں اپنے سینے میں دبائے ہوئے ہے ضرورت ہے کہ اس شعلۂ نم خوردہ کو شعلۂ جوالہ بنا دیا جائے۔

اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ اقبال کے شاہین کا تصور دنیا کے غارت گروں (مسولینی) کو مدد دیتا ہے۔ حالانکہ یہ شاہین کا کردار اقبال کا ایک مثالی کردار ہے جو مضبوط اور طاقتور ہونے کی باوجود ظالم نہیں جو طاقت اس لئے چاہتا ہے کہ طاقت میں توازن قائم رہتا ہے کوئی کتنا ہی اہنسا اور امن کی دیوی کا پجاری بن جائے تلوار کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ خیال کی دنیا سے نکل کر جب بھی عمل کی دنیا میں قدم رکھا جائے گا۔ دنیا میں توازن پیدا کرنے کے لئے قوت کی ضرورت ہو گی۔ اقبال تصورات کی دنیا میں سیر کرنے کے بجائے عمل کی طرف فطرتاً راغب تھے اس لئے انھوں نے شاہین کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے صفات فقر۔ خود داری علوئے ہمتی انسانی زندگی کی ضمانت ہیں۔ یہی توازن قوت مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا جائے گا۔ بدگمانیاں دور ہوتی جائیں گی۔ ادب اس مقدس فرض کو

بخوبی پورا کر سکتا ہے۔ اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے کام کا نہیں۔ اقبال کے مخاطب صرف اہلِ ہند ہی نہیں تھے، ساری دنیائے انسانیت اور خاص کر دنیائے اسلام کے مسلمان تھے۔ اس لئے انھوں نے فارسی زبان کو اختیار کیا۔ یہ ایک مجبوری تھی اس لئے ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے کچھ زحمت اٹھانی پڑے گی۔ بہتر ہوتا کہ یہ تمام کلام اُردو زبان میں ہوتا اور پھر تراجم کے ذریعہ عام کیا جاتا۔

غرض اقبال کی شاعری میں اشتراکیت کا فلسفہ نہ سہی اشتراکی اُصول بہت کچھ نظر آتے ہیں۔ یہ وہی اصول ہیں جنھیں اسلام نے پیش کیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اصول ایک جدید سوسائٹی میں مرتب کئے گئے اور اسلامی اصولوں کی تدوین صدیوں پہلے کی گئی تھی۔ روح ایک ہی ہے مزید اسلام کی روحانی قدروں کے سہارے اس فلسفہ کو اور ٹھوس بنایا جا سکتا ہے۔ اقبال مادیت کے دشمن نہیں بلکہ محض مادیت کے دشمن ہیں۔ اُن کا فلسفہ مادّی مسائل اور وجدانی کیفیت کا بہترین امتزاج ہے اور اس میں دین و دنیا کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اسی چیز کو اسلامی اشتراکیت، کہا جاتا ہے۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں "اقبال کی روح اشتراکی ہے وہ اسلامی سوشلسٹ ہیں"

اقبال کے بعد چوتھے باب میں اُردو ادب کی دو اور اہم شخصیتوں کا

ذکر ملتا ہے یہ پریم چند اور جوش ہیں۔ سردار جعفری نے دونوں کی تصویریں نامکمل بنائی ہیں، اُن کا خیال ہے کہ " پریم چند میں طالسطائی کی روح ملتی ہے۔ اور جوش میں شبلی کی " یعنی جوش پہلے رومانی اور پھر حقیقت نگار اور پریم چند پہلے حقیقت نگار اور بعد میں رومانی۔ یہ مشابہت کسی قدر صحیح ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کی بنیاد انسان دوستی پر ہے وہ ماضی حال اور مستقبل تینوں کے ترجمان ہیں اور گاؤں اور شہر کی زندگیاں ان کے یہاں ایک دوسرے سے گلے ملتی نظر آتی ہیں۔ بقول عزیز احمد " پریم چند دو دنیاؤں کو ایک ساتھ ملاتے ہیں " پریم چند کی گہری نظر بابِ وقت سماج، تمدن، سیاست، مذہب سب پر بڑی عائر پڑتی ہے۔ یہ نظر اس قدر وسیع اور انقلابی ہے کہ اس میں ماضی کے فرسودہ واقعات اور دیہاتی زندگی کی بدحالی ایک انقلاب آفریں پیغام بن جاتے ہیں۔ لیکن جو چیز پریم چند کی ادبی روکو شکست کرتی ہے وہ ان کی ماضی پرستی ہے۔ پریم چند ایک جدید ذہن اور انقلابی نظر رکھنے کے باوجود ماضی سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ جو کبھی گاندھی ازم کے پرچار کی صورت میں اور کبھی پراچین سبھیتا (قدیم ہندوستانی تہذیب) کی ترویج کی شکل میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ البتہ آخری دور میں وہ ترقی پسندی کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین نے ٹھیک لکھا

ہے کہ " پریم چند ترقی پسندی کے پہلے زینہ پر تھے " سردار جعفری نے انھیں ایک اسٹرا کی قرار دیا ہے جو ترقی پسندی سے بھرپور ہے ۔ اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ۔ پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا اور سماجی و عمرانی مسائل کو اپنی تحریروں کا موضوع قرار دیا اور فرسودہ رجحانات و بوسیدہ عمارات کو ختم کرلینے کی کوشش کی پریم چند کے متعلق علی عباس حسینی پنڈت کشن پرشاد کول اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے جو نظریہ قائم کیا ہے وہ ان حضرات کے مخصوص نقطہ نظر کا ترجمان ہے ۔ اس لئے اسے صحیح تنقید نہیں کہہ سکتے ۔ پریم چند کے متعلق فراق نے بڑی اچھی بات کہی ہے ۔ " پریم چند کے کارنامے ایک گراں قدر ماہر فن کے ادھیڑ سے کارنامے معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کا چمکتا ہوا تخیل کچھ دور جاکر ماند پڑجاتا ہے اور اُن کی تصنیف کے ہر صفحہ پر ہندوستانی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کے پہلے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے " اس کے علاوہ پریم چند کے فن کا احساس بھی مکمل نہیں ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی زبان کردار اور ماحول کے مطابق ہوتی ہے ۔ لیکن وہ اس میں تناسب قائم نہ رکھ سکے ۔ ان کی زبان میں روانی کی کمی ہے ۔ اور اُن کی تحریریں طوالت کا بھی شکار ہیں ۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کہاں بس کرنا چاہیئے اس کے باوجود پریم چند کی شخصیت ایک عظیم شخصیت ہے اور وہ

بہت سے لازوال کرداروں کے خالق ہیں۔

پریم چند کی طرح جوش کی بھی شخصیت جاذب نظر ہے۔ سردار جعفری نے جوش کی نظموں سے ترقی پسند تحریک کو بہت تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کی شاعری کا تجزیہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ جوش کی شاعری کے صحیح خدوخال جعفری صاحب کے یہاں نہیں ابھرتے بلکہ تاثراتی رنگ غالب ہے۔ جوش کے متعلق ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تفصیلات میں ان سے جوش کی شاعری کے بہت سے بڑے گوشے چھوٹ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جوش کی بہت سی نظمیں ایجیٹیشن قسم کی ہیں۔ ان کی مردانہ اور غازیانہ شاعری کے پیش نظر یہ تجزیہ بہت صحیح ہے اور ان کی بلند آہنگ شاعری کی قدر و قیمت بھی ہے لیکن شاعری محض شدت جذبات کا نام نہیں جوش کی شاعری میں کوئی واضح اور ٹھوس نقطۂ نظر نہیں ملتا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شاعر کے یہاں کوئی نقطۂ نظر ضرور ہو۔ لیکن اسے انتشار خیالی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے جوش انتشار کا شکار رہیں اور جذبات کی رو میں بہہ کر وہ جس بربریت کے خلاف زور شور سے چلاتے ہیں اسی پر سلام بھی بھیجتے ہیں۔

ایسے اشعار نفرت کے جذبہ کے ماتحت لکھے گئے ہیں، اور شاعر یہاں زندگی کا واضح نقطۂ نظر نہ رکھنے کی وجہ سے جذبات

کی رَو میں بہہ گیا۔ انھیں متضاد خیالات کی وجہ سے اُن کے یہاں تلخی تیزی نفرت، حقارت اور نعرہ زنی کے اثرات اُن کے حریت پرور نغموں میں مِل جُل گئے۔ یہ مجاہدانہ نغمے جوش وحرارت تو ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن ابدیت سے دُور ہیں۔ جوش کی شاعری کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر صرف تماشائی ہے اس میں انسانیت کا سوز و گداز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کی آواز مدھم ہوتی جارہی ہے۔ جوش کے فنی کمال کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ واقعی الفاظ کا اتنا بڑا جادوگر اردو ادب میں اِس سے پہلے نہیں پیدا ہوا۔ زوال، شہنشاہیت کی کتنی مکمل تصویر ہے۔

نہ چین ہو جفا جب تک جبین شہریاری پر
نہیں ہوتا کلاہ خسروی میں بانکپن پیدا

جوش کے بعد علی عباس حسینی۔ قاضی عبدالغفار۔ حسرت موہانی۔ فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، ساغر نظامی، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کا سرسری تذکرہ ملتا ہے۔ اور جگر صاحب کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ مشاعرہ کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں سماجی احساس بعض مخصوص حالات کے علاوہ نہیں ملتا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ جگر کی شاعری کی قدر و قیمت ہے، وہ مشاعروں کے ذریعہ عوام تک پہنچے لیکن انھوں نے صرف مشاعروں تک ہی مقبولیت کو پیش نظر نہیں

رکھا بلکہ انسان دوستی، خلوص، جذبۂ حریت اور خودداری کو ہمیشہ برقرار رکھا وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں ہیں لیکن اُن کے یہاں سماجی احساس ملتا ہے۔ اور آزادی کی لگن کی اچھی مثال ساقی نامہ ہے۔ غزل کے شاعر ہونے کی وجہ سے اُن کے یہاں مسائل زندگی اشاروں اور کنایوں میں ادا ہوتے ہیں۔

پانچواں باب ترقی پسند تحریک سے متعلق ہے۔ اس میں وہ تمام چھوٹے بڑے لکھنے والے آگئے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں اور اسی کے اغراض ومقاصد کے تحت ادبی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک ماضی کی روایات کا صحیح احترام نہیں کر سکے ہیں۔ تاہم ماضی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں لیکن ابھی تک اس نقطہ پر نہیں پہنچے ہیں جہاں جوان اور بوڑھی نسل ایک دوسرے سے اشتراک کر سکیں یہ اشتراک بہت ضروری ہے۔ بدگمانی دور کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ بوڑھی نسل فن کی زیادہ قائل ہے۔ اس لئے وہ نوجوانوں کی فنی کمزوریوں پر سخت نالاں ہے اور ان کی تخلیقات کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ حالانکہ کسی نسل کے تجربات خواہ کتنے ہی سطحی ہوں محض بے کار نہیں ہوا کرتے۔ جدید نسل کے ذہن میں سماجی احساس بوڑھوں سے زیادہ ہے، تہذیب کے کارواں کو

اس نسل نے آگے بڑھایا ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد بعض مادی حقائق پہ ہے اور ایک عرصہ سے اس کا تجربہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ تجربہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی ہوا۔ اور مادی مسائل نے حد سے زیادہ غلبہ پالیا لیکن یہ بے اعتدالی کم ہوتی جا رہی ہے۔ تنگ خیالی اور تعصب کی گھٹن یہ تحریک اب محسوس کرنے لگی ہے۔ ابھی اسے اور زیادہ کشادہ دلی سے کام لینا ہے۔ اس تحریک میں ابھی تک ہنگامی کیفیت غالب ہے لیکن افسانے اور تنقید میں نمایاں ترقی کی ہے۔ فن اور ہئیت میں بہت سے نئے تجربے کئے ہیں۔ کرشن چندر اردو کا سب سے اچھا افسانہ نگار شروع سے اس تحریک سے وابستہ رہا۔ فیض کی شاعری انھیں تصورات کے ماتحت پروان چڑھی۔ فیض ایک نئے دبستان کے بانی نہ سہی (سردار جعفری فیض کو جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کے حسین امتزاج کے نئے دبستان کا بانی سمجھتے ہیں) پھر بھی اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو ابدی قدروں سے ہم آہنگ کیا اور سامراج کے خلاف آواز بلند کی۔ کرشن چندر کے افسانوں نے زندگی کی کشمکش اور سماج کی زبوں حالی کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک کا بڑا کارنامہ ہے کرشن چندر نے شروع سے اس تحریک کا ساتھ دیا اور اسی کے اغراض و مقاصد کے ماتحت اپنی تخلیقات پیش کیں۔

آج ترقی پسند ان لوگوں سے اپنے کو علیحدہ بتاتے ہیں، جو جنسی کج روی کا شکار ہو گئے ۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کا رشتہ اس تحریک سے کمزور ہوتا جا رہا ہے ۔ بعض حضرات بالکل منہ موڑ گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ابتدا میں ترقی پسندوں نے انھیں مصلحتاً گوارا کیا ۔ منٹو کی افسانہ نویسی ترقی پسندی ہی سے شروع ہوئی یہ اور بات ہے کہ اس کا شباب جنسی غلبہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ عصمت خود مدتوں جنسیات کی طرف مائل رہیں، اب وہ رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کش ہو رہی ہیں ۔ اب فحاشی اور ترقی پسندی دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں ۔ ترقی پسند تحریک میں اب صحت مند رجحانات عام ہوتے جا رہے ہیں لیکن اب بھی مستند اہل قلم ترقی پسندی سے قریب ہونے کے باوجود اس تحریک سے وابستہ نہیں ہو سکے ۔ سردار جعفری کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آل احمد سرور ہماری صفوں میں داخل ہو گئے ہیں، سرور صاحب ترقی پسندی کے نہ پہلے مخالف تھے اور نہ اب ہیں ۔ البتہ اس تحریک میں جس قدر سلجھاؤ پیدا ہوتا جائے گا، سرور صاحب اس سے قریب ہوتے جائیں گے ۔ سرور صاحب طبعاً معتدل مزاج واقع ہوئے ہیں ۔ ان کا دماغ تاثراتی سلبی اور تخریبی اثرات سے پاک ہے ۔ اُن کی نظر وسیع اور گہری ہے وہ ذہنی حد بندی کے قائل نہیں اور نہ گروہ بندی کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ان پر کسی پارٹی کا لیبل لگانا

نامناسب ہے۔ ان کا ذہن کائناتی اور ان کا نقطۂ نظر ہمہ گیر ہے۔ میں نے
بارہا انھیں اقبال کا یہ شعر پڑھتے سنا ہے۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

نئے اور پرانے چراغ کے دیباچہ میں انھوں نے اپنے ادبی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے لکھتے ہیں:۔

"میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار میں محض نیا اور پرانا کہلانا پسند نہیں کرتا، میں نیا بھی ہوں اور پرانا بھی لیکن قدرتی طور پر اپنے میلانات وخیالات سے متاثر ہوں۔"

اسی طرح کے خیالات کا اظہار ۲۴ اپریل ۱۹۵۳ء کو رفاہ عام کلب لکھنؤ میں یوم اقبال کے موقع پر کیا تھا اور ادب میں اسی طرح کی ذہنی قلعہ بندی کی مذمت کی تھی۔ سرور صاحب کے اثرات بہت کچھ اس دور کے ادیبوں پر پڑے ہیں۔ سردار جعفری کی کتاب میں بھی ان اثرات کی جھلک ملتی ہے اور جہاں یہ تاثر موجود ہے وہاں جعفری صاحب کی شدت پسندی پگھلتی نظر آتی ہے، وہ اشتراکی ہونے کے باوجود ماضی کے گوہر نایاب کی تلاش میں سرگرم ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے ادبی تجربات وسیع اور صحت مند ہیں۔

افسانہ اور تنقید کے ساتھ ساتھ غزل کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ فیض، مجروح، مخدوم، جاں نثار اختر، جذبی کی غزلوں پر کون ایمان نہیں لائے گا۔ یہ سب اسی تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ترقی پسند غزل کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ خود ڈاکٹر صاحب موصوف کا غزل کا نقطہ نظر نہایت تنگ اور محدود ہے انھوں نے غزل گو شاعر کو ایک راہب بنا دیا ہے۔ جو اپنی دنیا میں مست ہے جسے عالم کی کچھ خبر نہیں ملاحظہ ہو۔

"غزل گو شاعر اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنی ذات میں سب کچھ پالیتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب اس رو میں اقبال کی عمرانی منظومات کو غزل کے دائرہ سے خارج کر بیٹھے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ غزل کو صرف عشق مجازی تک محدود رہنا چاہیئے، اس دور میں ناقابل قبول ہے بقول حمید احمد خاں "غزل کے موضوع کے متعلق یہ تنقید صدر اول کے متغزلین کے بعد کسی نے تسلیم نہیں کی۔ غالب نے بھی انھیں پابندیوں سے عاجز آکر کہا تھا:۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل میں عشق مجازی کی بھی گنجائش ہے اور عشق حقیقی کی بھی۔ فلسفہ
و عمرانیات اور سیاسیات بھی اس دائرہ میں آتے ہیں۔ جدت ہوئی
غزل میں یہ رنگ پیدا ہو چکا ہے اس کی وسعت نے اسے قبول کر لیا
ہے اس کے خلاف آواز اٹھانا الٹی گنگا بہانا ہے۔

چھٹا حصہ ترقی پسندوں کی تخلیقات سے متعلق ہے۔ اس میں
مجاز۔ مجروح۔ جعفری۔ اختر شیرانی۔ مخدوم۔ جاں نثار اختر پر
سرسری تنقیدیں کی گئی ہیں۔ سردار صاحب کا خیال ہے کہ کیفی اور
ساحر کی شاعری انتہا پسندی کا شکار رہے انھوں نے ترقی پسندی
کے زعم میں فنون لطیفہ کا مذاق اڑایا ہے اور تاج محل کی تخلیق کو نہ
صرف بے کار بلکہ مضحکہ خیز بتایا ہے۔ جعفری صاحب نے یہ کہہ کر
کہ ان حضرات میں تاریخی بصیرت کی کمی ہے تنقید کا حق ادا نہیں کیا
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہنی پس منظر میں نفرت
شبہ اور تلخی کا شدید جذبہ کارفرما ہے انھیں ماضی سے نفرت اور
قدیم زندگی سے بیزاری ہے۔ ان کا تاریخی شعور نہ صرف ناقص
بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اُن کی یہ زہرناکی زندگی کے تسلسل کو منقطع
کر دیتی ہے۔ اور تعمیر کے بجائے نفرت اور انتشار کی طرف لے
جاتی ہے۔ یہ حضرات ہر دَور کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے
ہیں اُن کی ذاتی پسند یا ناپسند ہر جگہ چھائی ہوئی ہے۔ انھیں
ماحول حالات اور زمانہ کا بالکل لحاظ نہیں ہے۔ یہ لوگ شاعر سے

زیادہ پروپیگنڈسٹ ہیں

جعفری صاحب ایک ترقی پسند نقاد ہیں حالانکہ شاعر یا نقاد خانوں میں نہیں بٹتے وہ گروہ بندی سے زیادہ شیرازہ بندی کے قائل ہوتے ہیں۔ اور ادبی شہ پاروں کو کسی سیاسی یا معاشی نظریہ کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے اُسے عالمگیر نقطۂ نظر سے پرکھتے ہیں۔ سردار جعفری ایک تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود ایک عالمگیر برادری اور انسانیت کی طرف مائل نہیں ہیں۔ ان کی قوتِ نقد بار بار ترقی پسندی یا غیر ترقی پسندی میں اُلجھتی ہے لیکن ان کا وسیع ذہن اس حصار کو توڑ کر ہر چیز کو ایک بلند نصب العین کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ جعفری صاحب نے بعض دوسرے شاعروں وفنکاروں کو کسی گوشے میں بھی جگہ نہیں دی جو ادب و شاعری کے بلند منصب پر فائز نہ ہونے کے باوجود زندگی کا صحیح احساس رکھتے ہیں اور جن کے نغموں میں حق گوئی۔ آزادی و بیباکی بیداری کی اُمنگیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تک ترقی پسند ادب پر جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن میں یہ کتاب سب سے بہتر ہے۔ لیکن بعض بڑی بے اعتدالیاں بھی موجود ہیں۔

جعفری صاحب نے زبان کے معیار کو برقرار رکھنے کی

کوشش کی ہے۔ شعوری طور پر سادگی کا خیال رکھا ہے اور اسی وجہ سے بعض الفاظ کو عام فہم بنانے کے لئے تبدیلیاں کی ہیں مثلاً عقل پسندی اور مکملیت وغیرہ۔ لیکن اس تبدیلی سے کوئی خاص فائدہ نہیں نظر آتا۔ بلکہ الفاظ کے درمیان جو نازک فرق ہوتا ہے وہ باقی نہ رہ سکے گا۔

اُردو تنقید کلیم الدین کی نظر میں

اُردو تنقید میں پروفیسر کلیم الدین اپنے انفرادی خیالات اور سنسنی خیز جملوں کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ اُردو تنقید پر ایک نظر، اُن کے انوکھے خیالات کا مظہر ہے۔ اس کتاب میں بہت سے نقادوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جگہ جگہ تنقیدی نظریات پر بحث کی گئی ہے، لیکن یہ نظریات زیادہ تر مغربی تنقید سے ماخوذ ہیں۔ مشرقی ادب کو مغربی طرز تنقید سے پرکھنے کی رَو میں بہت سی عجیب و غریب باتیں زیر بحث آگئی ہیں۔ یہی کیفیت کتاب کی دلچسپی کا باعث بن گئی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ ان اصولوں کی صداقت سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کی تقلید ضرور مشکل ہے۔ یہی وہ تضاد اور تصادم ہے جو کلیم الدین کی نظر سے آخر تک پوشیدہ رہا۔ یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ تمام بحث محض بحث بن کر رہ گئی۔ اور اُن کی خیالی اور قیاسی فضا ناخوشگوار محسوس کی جانے لگی۔ کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ "اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی

موہوم کمر" اس جملے کی شاعرانہ لطافت پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ لیکن اس فیصلے سے، اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ادب میں اس طرح کے فیصلے سخت مضر اور حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ اُردو تنقید کا وجود نہ تو محض فرضی ہے اور نہ خیالی، وہ تبصرہ نگاری اور تذکرہ نویسی سے آگے بڑھ چکی ہے اُس نے بدلتے ہوئے رجحانات اور وقت کے تقاضوں کو پہچانا ہے اُس نے اپنی روایات کے ساتھ برابر قدم آگے بڑھایا ہے۔ اُردو ادب کے صفحات میں اس کا سُراغ ملتا ہے۔

اُردو میں وجہی سے لیکر شیفتہ تک برابر تنقیدی شعور ملتا ہے۔ لیکن یہ تنقیدی شعور وقیع اور ترتیب وار نہیں۔ یہ سماجی سیاسی اور تمدنی مسائل کی عکاسی نہیں کرتا۔ یہ تنوع اور زندگی کی بنیادی قدروں کی اشاعت میں مدد نہیں دیتا۔ لیکن شعر و ادب کی ماہیت اور بعض فنی خوبیوں پر روشنی ضرور ڈالتا ہے۔ یہ تصور محدود ہونے کے باوجود بعض صالح، روایات کا حامل تھا لیکن شعر کی دلفریبی الفاظ کی مرصع سازی، محاورات، کی صحت اور تراکیب کی چُستی تک محدود تھا اس دور میں اس سے زیادہ اُمید رکھنا فضول ہے۔ آج جبکہ الفاظ پر خیالات نے ترجیح حاصل کرلی ہے لیکن الفاظ کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اس لیے ایک صحت مند تنقیدی ماحول پیدا کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ تذکرہ گلستانِ سخن، نکات الشعراء اور گلشن بیخار وغیرہ میں شاعری کی ماہیت پر تو بحث نہیں کی گئی ہے

لیکن متقدمین اور معاصرین پر بے لاگ رائیں منزو رملتی ہیں۔ میتر کا تنقیدی شعور صحت مند اور بلند تھا۔ انھوں نے کسی پست یا ناقص چیز کی تعریف نہیں کی۔ سودا کے متعلق باوجود ہم عصر ہونے کے ان کی رائے قابلِ قبول ہے۔ "ہمہ را خوب میگوید خوشگو است فکر عالی و برجستگی" جیسے بلیغ جملے سودا کی شاعری کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ شیفتہ کا معیارِ تنقید میر سے مختلف ہے۔ اُن کے یہاں شعریت کا معیار زیادہ مہذب اور سنجیدہ ہے۔ اس میں شرافت زیادہ ہے۔ نظیر کا کلام اُن کے معیارِ شرافت پر پورا نہ اُتر سکا۔ نظیر کا عامیانہ انداز انھیں مبتذل اور سوقیانہ نظر آیا۔ اس لئے وہ اسے سراہ نہ سکے۔ دراصل شیفتہ ایک پُرتکلف دور کے نمائندے ہیں جہاں حقیقت سے زیادہ تصنع کو دخل تھا۔ وہ ناسخ کے دلدادہ تھے۔ "نسیم چمن نازک خیال است" جیسے جملے شیفتہ کے قلم سے ٹپک پڑے۔ مومن کی نازک خیالی اُن کے خیال میں شاعری کا اصل جوہر ہے مومن کے خیالی معمے، اور ان کی فکری گتھیاں شیفتہ کو مرعوب کرلیتی ہیں۔ غرض عرصے تک اُردو تنقید اسی محور پر گھومتی رہی۔ ممکن ہے کچھ دنوں تک یہ روش اور چلتی ـــــ لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے اُسے دوسرے راستہ پر ڈال دیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد زندگی کے تقاضے تیزی سے بدلنے لگے۔ مغرب کے اثرات نے قدیم نقوش کو دھندلا تو کر دیا لیکن انھیں یک لخت مٹا نہ سکا۔ حالات کی تبدیلی کے باوجود آبِ حیات۔ گُل رعنا

ور شعرالہند جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں بدلتے ہوئے امزات کا
پتہ نہیں دیتیں۔ بلکہ قدیم تذکروں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اِن
کتابوں کی روح قدیم ہے ترتیب اور تفصیل کا اضافہ ضرور ہوا۔
تاریخی لحاظ سے ان میں تسلسل اور باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ اِن
میں شعرار کی قدر و قیمت اور اُن کا درجہ متعین کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ
تذکرے تنقیدی شعور کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔
آبِ حیات چند تنقیدی اشارے اور منتخب اشعار کا گلدستہ،
نہیں اس میں تاریخی تصور کا احساس پایا جاتا ہے۔ تاریخ۔ تبصرہ اور
سیرت نگاری کے نقوش اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ تسلسل اور ارتقار
میں اس سے مدد ملتی ہے۔ اس کے بلیغ فقروں اور خوبصورت جملوں
میں اکثر پوری شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ انشا کی شاعری اپنی
ظرافت اور جدت کے لئے مشہور ہے، آزاد کا یہ فیصلہ کہ "انشا 1
نے ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے" یہ انشا کی شاعری
پر صحیح تنقید ہے۔ آزاد نے قدیم ادبی سرمایہ کو گمنامی سے نکال کر
منظرِ عام پر پیش کر دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا بقول شیخ
اکرام "گویا یہ کتاب اُردو شعرار کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئی"
اِن خوبیوں کے باوجود کلیم الدین کی نگاہ میں آبِ حیات کی اہمیت
'فسانہ و افسوں' سے زیادہ نہیں۔ ایسا کہنا نا انصافی ہے۔
بے شک آبِ حیات کی انشا پردازی اس کا سب سے بڑا عیب

ہے۔ یہ تحقیق اور تنقید کے لحاظ سے مکمل نہیں ہے۔ اس میں جانبداری اور تعصب نمایاں ہے۔ فکر کی کمی ہے۔ ذوق کی تعریف نے انھیں 'کارٹون' بنا دیا ہے۔ مومن و غالب کے نقوش بھی بھدے ہیں۔ اِن خامیوں کے باوجود آبِ حیات میں ایسی خوبیاں بھی ہیں جو اختلافات کے انبار میں گم نہیں ہو سکتیں۔ اس کی اہمیت تنقیدی کم تاریخی زیادہ ہے۔ آب حیات کوئی مکمل تنقیدی صحیفہ نہیں بلکہ عہد بہ عہد کی ادبی تبدیلیوں کی تاریخ اور انقلابات شعری کی آئینہ دار ہے۔

آبِ حیات کے بعد 'گلِ رعنا' اور 'شعر الہند' کی اہمیت ہے یہ دونوں کتابیں بھی تذکرے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ اس وقت لکھی گئیں جب 'مقدمہ شعر و شاعری' کا غلغلہ بند ہو چکا تھا۔ اور ملک میں جدید رجحانات مقبول ہو رہے تھے۔ سر سید تحریک کے اثرات سے ملک میں ایک ترقی یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن سر سید نے علی گڑھ تحریک کی معرفت مسلمانوں کی تمدنی زندگی میں جو وسعت پیدا کی تھی اُسے قبولیت حاصل ہو جانے کے باوجود سب نے قبول نہیں کیا بلکہ ایک طبقہ ایسا تھا جو اس سیلاب کو روکنا چاہتا تھا یہ طبقہ قدامت کی طرف مائل تھا وہ ماضی میں توانائی اور صحت مندی کی علامات پاتا تھا۔ اور نیک نیتی سے ماضی کے کاموں کو ہر درد کا مداوا تصور کرتا تھا۔ سر سید اور ان کے مخالفین دونوں کا مقصد مسلمانوں کی

ذہنی حالت کو بلند کرنا تھا۔ لیکن راستے الگ الگ تھے۔ یہ راستے اس قدر متضاد ہوتے گئے کہ اُن کے ڈانڈے آج تک نہ مل سکے۔ یہ اختلاف صرف ادبی تصورات اور علمی نظریات ہی تک محدود نہ تھا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں رونما تھا۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے عبدالسلام ندوی ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو مغربی افکار اور جدید رجحانات کے مخالف ہیں اسلئے شعرالہند کا قدیم طرز کا تذکرہ ہوتا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ تذکرہ قدیم فضا میں سانس لیتا ہے۔ کلیم الدین کا خیال ہے کہ عبدالسلام ندوی تنقید کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔ یہ فیصلہ حقائق پر مبنی نہیں۔ ندوی صاحب شعوری طور پر قدیم تنقید نگاری کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔ اُن کی صلاحیت اور عدم صلاحیت کی بحث سے قطع نظر صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ندوی صاحب کیوں قدیم تنقید نگاری کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں؟ عبدالسلام صاحب ایک مذہبی عالم ہیں وہ 'شبلی اکیڈمی' کے درخشاں ستارے اور قدیم تصورات کے دلدادہ ہیں۔ اُن کا مقصد قدیم علوم اور انداز فکر کی تبلیغ کرنا ہے۔ وہ جدید تصورات کو قوم کے لئے مضر ہی نہیں مہلک خیال کرتے ہیں۔ اس لئے حالی اور ان کے تصورات سے انھیں اختلاف ہونا لازمی تھا۔ یہی اُن کا مشن ہے اور یہی مسلک۔ اُن کا راستہ سرسید تحریک سے الگ ہے۔

بحیثیت نقاد کلیم الدین کا فرض تھا کہ وہ ان اسباب و علل کا پتہ لگاتے کہ عبدالسلام قدامت کی طرف کیوں مائل ہیں۔ اس انداز فکر اور نصب العین پر نہایت ایمانداری سے بحث کرتے تا کہ ان کی رہنمائی میں واقعات تاریکی سے نکل کر روشنی میں آجاتے۔ کلیم الدین کی تنقید کے صفحے کے صفحے پڑھ جائیے، عبدالسلام کا نقطۂ نظر واضح نہیں ہوتا اور نہ ان کے مسلک کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم و جدید تصورات کا فرق بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ تنقید میں محض تلخ جملے اور کٹر نظریات مفید نہیں ہو سکتے بلکہ ہمدردی اور ایمانداری کی ضرورت ہے۔ تنقید میں خود یقین کر لینے سے زیادہ یقین دلانے کی ضرورت ہے۔

کلیم الدین کی تنقید تقریباً ہر منزل پر ناہموار نظر آتی ہے۔ حالی کی ناقدانہ صلاحیت کو تقریباً ہر صاحب نظر نے تسلیم کیا ہے، لیکن کلیم الدین ان کے قائل نہیں۔ ان کی نظر میں حالی کے 'خیالات ماخوذ' 'نظر سطحی' اور 'سرسری' تھی۔ انھوں نے اعتراضات کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے۔ حالاں کہ حالی نے شاعری کو تفریح اور تفنن کے چکر سے نکال کر اسے مقصدی رنگ دیا۔ وہ جدید ادبی تنقید کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے عملی و نظری تنقید کے بیش بہا نمونے پیش کئے اور ادب کو دائمی قدروں کی طرف لے جانے میں شدید مخالفت کا سامنا کیا۔ لیکن کلیم الدین کے خیال میں حالی شاعری کو غیر ضروری سمجھتے تھے، اسے اخلاق کے تابع کرنا چاہتے تھے۔

بے شک اُن کے یہاں اخلاقی نقطۂ نظر غالب ہے، لیکن حالی نے ادب میں نئی راہیں پیدا کیں۔ زندگی کے تقاضوں کو سمجھا اور برتا۔ مبالغہ غلو اور اغراق کے گرد و غبار سے شاعری کے آئینہ کو صاف کیا۔ اصلیت، سادگی اور جوش کے ذریعہ شعر کا ایک بلند معیار پیش کیا۔ اُردو ادب میں مغربی افکار اور دوسرے زبانوں سے استفادہ کی راہ کھولی۔ تعصب، نفرت تنگ خیالی کے خلاف آواز بلند کی۔ ماضی کی کورانہ اور اندھی تقلید سے ہٹا کر ماضی کا صحیح احساس پیدا کیا۔ زندگی کے مسائل کے ساتھ آرٹ کی آمیزش کا صحیح نقشہ بنایا۔ البتہ آرٹ کی پرستش سے روکا، مختلف دبستانوں اور نظریوں کی تفریق مٹانے کی کوشش کی۔ "غزل کی گردن بے تکلف مارنے" کے بجائے اس میں اصلاح کی تجاویز پیش کیں۔ اور اُن پر عمل بھی کر کے دکھایا۔ مشاہدۂ فطرت، مطالعۂ کائنات کی مدد سے شاعری کو تخلیقی راستہ پر لگایا۔ جذبہ اور حسن کی قدر کرنا سکھایا۔ فکر اور گہرائی سے آشنا کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ حالی نے تنقید کو کیسا پایا اور کیسا چھوڑا۔

حالی ایک اصلاحی دور سے گزر رہے تھے اس لئے اُن کے یہاں اخلاق کا غلبہ نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں خیال کی اہمیت سے الفاظ کی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی حالی اُردو تنقید کے سالار ہیں۔ آج بھی اُردو تنقید "حالی کی ذہنی قیادت کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔" کلیم الدین اُن کے اجتہادات کو کافی نہیں سمجھتے

وہ حالی کی مشکلات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اس دور میں اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ حالی نے وہ کام کیا جو ایک باضابطہ جماعت کا کام تھا۔ حالی کے یہاں سطحیت نہیں دقت نظر اور گہرائی ہے۔ باضابطگی اور شعور قدم قدم پر نمایاں ہے۔ کلیم الدین نے اُن کے روشن کارناموں کی قدر نہ کی اور اُن کی خامیوں پر نظر رکھی۔ لیکن اس کے باوجود انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ حالی اُردو کے سب سے اچھے نقاد ہیں۔

حالی نے مغربی افکار سے استفادہ کا جو دروازہ کھولا تھا وہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ شبلی جیسے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے اگرچہ وہ حالی کے نقطہ نظر سے پوری طرح متفق نہ ہو سکے۔ تاہم اُن کی مشرق پرستی میں کسی قدر ڈھیلا پن ضرور پیدا ہو گیا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں خاص کر تنقید میں مشرق اور مغرب کے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ حالی سرسید تحریک کے رکن تھے اور اُس کے مبلغ بھی۔ شبلی نے سرسید کے ساتھ کام کیا۔ لیکن اُن کا آخری فیصلہ سرسید تحریک کے خلاف رہا۔ شبلی عربی ادب کے جید عالم تھے اور قدیم علوم سے انھیں گہرا شغف تھا۔ حالی مشرقی ادب کی رگوں میں مغربی ادب کا خون پہنچانا چاہتے تھے۔ شبلی اس کو مشرقی ادب کے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ حالی کو مغربی ادب سے جو عقیدت تھی شبلی کو اس قدر نہ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ جذبہ بڑھتا گیا اور حالی اور شبلی کا راستہ الگ ہو گیا۔ "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" شبلی کے تنقیدی کارنامے ہیں۔ اِن میں

تاریخی اور تنقیدی خامیاں ہیں - ان کی اصلاحات مشرقی ہیں - تاہم ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا - اس لئے کلیم الدین کا یہ خیال صحیح ہے کہ "شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں" کلیم الدین احمد کہیں کہیں صحیح نتائج اخذ کرتے ہیں - لیکن یہ تفصیلات میں پہنچ کر بہک جاتے ہیں -

حالی اور شبلی کے بعد مولوی عبدالحق کی تنقیدوں کی اہمیت ہے - کلیم الدین نے اُن کی اُردو زبان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے - عبدالحق کے متعلق ان کا قلم کچھ دُور تک اعتدال کے ساتھ چلا ہے - اور سب سے زیادہ اُن کے ساتھ انصاف کیا ہے شاید عبدالحق کی شخصی عظمت اور بے لوث خدمت کی وجہ سے یہ اعتدال نظر آتا ہے - لیکن نکتہ چینی کا انداز ہر جگہ نمایاں ہے - عبدالحق کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرنے کے باوجود لکھتے ہیں :-

"وہ مغربی اثرات کے ماتحت اپنی تنقیدیں نہیں لکھتے اور مغربی خیالات کو سمجھنا، اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا پھر اُن سے مفید باتوں کا انتخاب کرنا یہ سب اُن کے بس کی بات نہیں "

عبدالحق صاحب مغربی ادب سے واقف ہیں - اس کی عظمت کے قائل بھی لیکن مقلد نہیں - ان کا خیال ہے کہ ہر قوم کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے - اس کے خیالات اور رجحانات ایک مخصوص ماحول کے تابع ہوتے

ہیں۔ ملکوں اور قوموں میں بہت سی باتیں مشترک ہونے کے باوجود ان میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ عبدالحق اِن اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ 'باغ وبہار کا مقدمہ' اور 'انتخاب میر کا مقدمہ' اُردو تنقید میں سدا بہار رہیں گے۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے میر کے غم کی عظمت کو محسوس کیا۔ اِن مقدمات میں مغربی تنقید سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ جدید تنقید کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کا نقطۂ نظر عالمگیر ہے۔ یہ ادب کے لیے ایک نیک شگون ہے لیکن اس سے کسی ملک کے ادب کی انفرادیت ختم ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس تحریک کے ماتحت دنیا کے تمام ادب ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے لیکن غیر ترقی یافتہ زبانوں کے ادب ترقی یافتہ ادب میں ضم نہیں ہوں گے اگر ایسا ہوگا تو ادبی دنیا میں بہت بڑا سانحہ ہوگا۔ ادب میں تنوع زیادہ دلکشی کا باعث ہے۔ عبدالحق نے تقلید کی گرم بازاری کے دور میں بھی اُردو ادب کی انفرادیت کی طرف سے آنکھ بند نہیں کی انھوں نے بے لاگ رائیں دی ہیں۔ تحقیق اور تنقید کی آمیزش کر کے اُردو تنقید میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا۔ تحقیق بغیر تنقید کے اور تنقید بغیر تحقیق کے تشنہ رہ جاتی ہے۔ کلیم الدین نے 'بانگ درا' اور 'مسدس حالی' کے مقدمات سے اختلاف کیا ہے۔ ممکن ہے دوسرے نقادوں کو بھی کلیم الدین سے اتفاق ہو۔ لیکن اِن کی خوبیوں

سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ عبدالحق صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے لیکن اس میں گہرائی اور سنجیدگی ہے۔ ان کی تنقیدات سے ادب کو مزور فائدہ پہنچا۔

رشید احمد صدیقی بھی اچھے نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن رشید صاحب زیادہ تر ایک مزاح نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں حالانکہ ان کا اصلی میدان مزاح نگاری ہے اور تنقید ان کی ادبی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ البتہ طبیعت کے مزاح نے ان کے تنقیدی مضامین میں ایک خاص قسم کی نکتہ سنجی اور لطافت پیدا کر دی ہے۔ بعض جگہ تنقید اور مزاح باہم اس طرح شیر و شکر نظر آتے ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم الدین نے ان کی طوالت اور جذباتی کیفیت پر جو اعتراضات کئے ہیں ان میں وزن بھی ہے اور صداقت بھی۔ چونکہ ظرافت نگار عموماً بات میں بات پیدا کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ کسی بات کو سیدھے سادے طریقہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ رشید صاحب بھی یہی کرتے ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے۔ وہ تعریف و توصیف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ تنقید کی نزاکت اس وزن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر رشید صاحب کی یہ خوبی ضرور ہے کہ انھوں نے کبھی تیسرے درجہ کی چیز کو نہیں سراہا یہ اور بات ہے

ر دہ فانی کو غالب پر ترجیح دیتے ہیں۔ رشید صاحب کو فانی کی سادگی غالب کی پیچیدگی کے مقابلے میں بہت پسند ہے۔ یہ سادگی بہت اچھی چیز ہے۔ لیکن غالب کی جدت پسند طبیعت سیدھا راستہ اختیار نہیں کرتی یہ غالب کا عیب نہیں کمال ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری۔ محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری کا بھی ذکر کتاب کی زینت ہے۔ بجنوری مرحوم پر انھوں نے کم نظری کا الزام لگایا ہے۔ یہ کوئی اچھا تجزیہ نہیں۔ بجنوری کی علمیت عام طور پر تسلیم کی جا چکی ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ انھیں غالب کے ساتھ ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہی 'محاسن کلام غالب' کا محرک ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ بجنوری نے اپنی ادب پرستی کا ثبوت دیا ہے اور مغربی افکار کی بھرمار کی ہے اور زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن بجنوری کی تنقید تحسینی رنگ کی ہے۔ جس سے بجنوری غالب کے اچھے نقاد تو تسلیم نہیں کئے جا سکتے لیکن اچھے ترجمان ضرور مانے جا سکتے ہیں ان کی تنقید میں مبالغہ ضرور ہے لیکن وہ مضحکہ خیز نہیں ہے۔ محی الدین زور اور عبدالقادر سروری اچھے نقاد نہیں ہیں۔ ان کے خیالات میں خامی اور کھردرا پن ہے۔ ان میں ذہنی پراگندگی اور الجھنیں نمایاں ہیں۔ فکر کی آزادی بھی ناپید ہے، نہ گہرائی ہے اور نہ بلندی۔ در اصل یہ حضرات صحیح اُردو تنقید کے نمائندے بھی نہیں البتہ اُردو ادب کے پرستار ضرور ہیں۔ کلیم الدین نے انھیں وہی درجہ دیا

ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی سب سے نوزائیدہ تحریک ہے۔ اس کا تجربہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اس کے اثرات اہلِ فکر حضرات نے قبول نہیں کئے ہیں لیکن ان کی نظر میں بعض لحاظ سے اس کی اہمیت ہے۔ کلیم الدین نے سب سے زیادہ اس تحریک سے خفگی کا اظہار کیا ہے۔ اُردو شاعری پر ایک نظر کے دیباچہ میں پروفیسر فضل الرحمٰن نے کلیم الدین کی ہمنوائی کرتے ہوئے ترقی پسند شاعری کو "تجاہل عارفانہ" کے نام سے یاد کیا ہے اور اس کی فطرت کو مصنوعی بتایا ہے، یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے اس میں ناانصافی سے کام لیا گیا ہے۔ ان حضرات نے ترقی پسند تحریک کی تہہ میں ڈوب کر حقیقت کو پانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اختلافات کو سطح پر دیکھا ہے تحریک اور افراد ہمیشہ دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ کلیم الدین نے تحریک کو افراد سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک بہت سی خامیوں سے پُر ہے۔ لیکن اس کے سہارے ادب میں بعض نئے تجربات بھی ہوئے اور بعض اضافے بھی اس لئے اس کی ماہیت پر روشنی ڈالنا اور اس کی نوعیت کا تجزیہ کرنا ہر نقاد کا فرض ہے۔ ادب میں ہمیشہ نئی تحریکات کا ابھرنا فطری امر ہے۔ یورپ کا ادب مختلف تحریکات سے آشنا ہو چکا ہے کسی نئی تحریک سے گھبرانے کی ضرورت

نہیں ہے۔ وہ کوئی سیلاب نہیں جو قدیم روایات کو بہالے جائے گا بلکہ
اس کے غیر فطری عناصر خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ ہمیشہ صالح اور
فطری اقدار نے مصنوعی بندشوں سے آزادی حاصل کی ہے۔

حالی نے اُردو ادب کو جن زندہ اور جاندار روایات سے
روشناس کرایا تھا اور ادب اور زندگی کا رشتہ تلاش کرکے ادب کو
زوال پذیر ہونے سے بچا لیا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اسے اور زیادہ
مضبوط کیا۔ اصناف اور اسلوب میں تنوع پیدا کیا اور خیالی بازیگری کا
جو طلسم کھڑا ہو گیا تھا اُسے توڑنے کی کوشش کی۔ حالی نے شاعری کو
مقصدی قرار دیکر اس سے کام بھی لیا تھا۔ ترقی پسندوں نے اس کی
افادیت پر اور زیادہ زور دیا۔ زوال پسند عناصر اور مجہول رجحانات
کے بدنما داغ کو ادب کی پیشانی سے مٹانے کی کوشش کی۔ نظم ونثر
افسانہ اور تنقید کا میدان اس کی توجہ سے زیادہ وسیع ہوا۔ ادب میں
سیاسی، معاشی خیالات اور حرّیت پسندی کو رواج دیا۔ لیکن بقول
ڈاکٹر عبدالحق "ترقی پسند" "ترقی پسندی" کے زعم میں بہت آگے
بڑھ گئے اور "خود پسند" و "خود سر" ہو گئے۔ اس تحریک کے سہارے
مذہب، اخلاق اور قدیم صحت مند روایات کا خوب مذاق اڑایا گیا۔
ماضی سے عام بیزاری کا اظہار کیا گیا اور قدیم سرمایہ کو جنت نصیب
بزرگوں کی نا واقفیت و کم نصیبی کا ورثہ سمجھا گیا۔ مارکس و راشتراکیت
کا پرچار کیا گیا۔ اور مارکس کو دنیا کا سب سے بڑا مصلح بتایا گیا۔ اشترا کیت

کے نام پر گھٹیا سے گھٹیا چیزوں کو سراہا گیا۔ "انجمن تحسین باہمی" کے ذریعہ ہر ناقص بات کی تعریف کی گئی۔ جس کی وجہ سے ادب میں صحافتی رنگ پیدا ہوگیا اور ترقی پسند ادب کا خاصا ذخیرہ محض پروپگنڈہ بنکر رہ گیا۔ کہیں اقبال کو اسلامی فاسسٹ بتایا گیا۔ اور کہیں کمیونسٹ غرض شاطرانہ چالوں سے کام لے کر آن کے کلام کی طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ ان باتوں سے ترقی پسند ادب کی ساکھ اکھڑ گئی اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے ادب میں جماعت پر زور دیا اور انفرادیت کے خلاف آواز اُٹھائی لیکن خود اشتراکی جماعت کی غلامی قبول کر لی۔ حتیٰ کہ آج لوگ اشتراکیت اور ترقی پسندی کو ایک دوسرے کے مترادف سمجھنے لگے۔ اپنی نظریات کے قبول کرنے پر اصرار کیا لیکن دوسروں کے خیالات کو گوارا نہ کیا۔ تنقید۔ افسانہ۔ شاعری اور زندگی کے ہر شعبہ کو اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا۔ خیالات کی خاطر الفاظ قربان کر دئے حالانکہ دنیا کے تمام تخلیقی کارنامے بلند خیالات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بہترین ترتیب ہی کی بدولت ادب عالیہ کہلائے۔ ترقی پسند نقادوں کی اکثریت بھی رَو میں بہہ گئی البتہ احتشام اور مجنوں کی تنقیدوں نے بہت سی اُلجھنوں کو دُور کرنے کی کوشش کی تاہم اس وقت تک ترقی پسندوں کا نقطہ نظر صحتمند نہ ہو سکا۔

کلیم الدین اور ترقی پسندوں کے نظریات میں بعد المشرقین

ہے۔ ترقی پسند ادب کو زندگی کا آئینہ مانتے ہیں۔ اس خیال سے
مشہور نقادوں نے بھی اتفاق کیا ہے۔ کیونکہ خارجی حالات اور
ماحول کا اثر ادب پر پڑنا لازمی ہے۔ کلیم الدین انسان کو کلی طور پر
ماحول کا پروردہ تسلیم نہیں کرتے۔ "نغمۂ گل" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں
"عموماً انسان کو ماحول کا پروردہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ محض افترا ہے
انسان اپنی دنیا اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس کی زندگی سے معمارئ جہاں
تو وابستہ ہے اور اس کی موت میں حیات کا چشمہ مضمر ہے۔" یہ خیال
قابلِ غور ہے۔ زندگی عوام و خواص دونوں کی جدوجہد سے مکمل
ہوتی ہے۔ کلیم الدین اور ترقی پسندوں کے درمیان شکم اور دماغ
کا جھگڑا ہے۔ کلیم الدین دماغ کو شکم پر ترجیح دیتے ہیں اور ترقی
پسند شکم پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ حالانکہ عملی حیثیت سے انسان
کی زندگی کی بالیدگی کے لئے شکم اور دماغ دونوں کی اہمیت
ہے۔ انسانی زندگی خانوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی۔

۱۔ اردو تنقید میں کلیم الدین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے بے لاگ
رائے دیں۔ ان کی صاف گوئی قابل احترام ہے لیکن ان کی تمام تر
رائیں صحیح نہیں ہیں۔ کلیم الدین کی انفرادیت اپنی دنیا آپ
بنانے پر مجبور کرتی ہے وہ اس علیحدگی سے مطمئن بھی ہیں۔ اس میں
کوئی شک نہیں کہ ان کے فن کا تصور اعلیٰ ہے۔ ان کے یہاں
شدتِ احساس ہے اور تخیل کی فراوانی بھی۔ وہ شاعری کو

بیش قیمت انسانی تجربات کا نچوڑ تسلیم کرتے ہیں اور اسے اعلیٰ دماغی تحریکات کا پرتو مانتے ہیں۔ اور ادراک کو شاعری کی روح رواں بتاتے ہیں اور پھر اسی معیار پر تنقید کے اصول اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تنقید نگاروں کے کسی گروہ میں شریک نہیں ہیں بلکہ تخلیقی قوتوں پر ایمان رکھتے ہیں، مغربی ادب کا اُن پر غیر معمولی اثر ہے۔ زیادہ تر ان کے دماغ کی تربیت مغربی افکار سے ہوئی ہے۔ البتہ ان کا گھریلو ماحول مشرقی اقدار کا حامل تھا۔ اس لئے مشرقی اور مغربی تصورات کی آمیزش نے انھیں ایسا مزاج عطا کیا جو مشرقی ذوق کو مکمل طور پر اپنا نہ سکا۔ انھوں نے مشرقی ادب کا مطالعہ ضرور کیا ہے۔ لیکن مشرقی ادب کا مکمل ذوق اُن میں رچ نہ سکا۔ لیکن وہ اپنے طور پر مطمئن ہیں۔

کلیم الدین نے اردو تنقید کا جو ارتقا پیش کیا ہے اس میں بعض نقادوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ جدید نقاد اپنے پیشروؤں کی معیت میں برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ بعض حضرات نے تنقید کے خاصے بلند نمونے پیش کئے ہیں۔ ان حضرات کی کوششیں اب بار آور ہو رہی ہیں۔ اس دور میں تنقیدی مضامین لکھنے والے عبدالحق، عبدالسلام، رشید صدیقی نہیں بلکہ سرور۔ اکرام۔ عزیز احمد اور احتشام وغیرہ ہیں۔ کلیم الدین نے نیاز کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ تقریباً دس سال سے اردو تنقید نے بہت کچھ فضا ہموار کر دی ہے۔ شاید اسی طرح

وقت کی گردش کلیم الدین کی تنقید کو بھی ہموار کر دیئے۔ ؎

بحیثیت مجموعی کلیم الدین کی تنقید سے اُردو تنقید میں بحث کا دروازہ کھل گیا۔ بہت سی خامیاں منظرِ عام پر آگئیں۔ اور بعض چیزوں کے سمجھنے میں مدد لی لیکن ان کی انتہا پسندی اور تلخی نے صحت مند تنقید کا خون کر دیا۔ ان کی روش تعمیری نہیں بلکہ خطرناک ہے وہ ایک نقاد کے منصب سے ہٹ کر محض نکتہ چیں رہ جاتے ہیں یہی اُن کی تنقید کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے، اُن کی تنقید سے فائدہ کم پہنچا اور نقصان زیادہ اگر وہ متوازن نقطہ نظر سے کام لیتے تو ان کی تنقید "گلستاں میں کانٹوں کی تلاش" نہ سمجھی جاتی بلکہ ایک مقدس فریضہ انجام دیتی۔

؎ یہ مضمون ۱۹۵۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس عرصہ میں کلیم الدین صاحب نے متعدد مضامین لکھے، اور اپنی تصانیف میں بعض اضافے بھی کیے ہیں۔ ان میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اور بعض اہم شخصیتوں پر اظہار خیال کیا ہے۔ آلِ احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین اور سید حسن عسکری پر مستقل مضامین لکھے ہیں۔ اگرچہ ان مضامین کی بنیاد بھی مغربی اثرات ہی پر ہے لیکن ان حضرات کی تنقیدی صلاحیت کا کسی قدر اعتراف بھی کیا ہے۔

نیازؔ فتحپوری بحیثیت نقّاد

اُنیسویں صدی کے آخر میں سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے جو اصلاحی اور اخلاقی نظام بنایا تھا۔ اس کی بے لطفی اور خشکی کا احساس بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہونے لگا تھا۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد اس احساس میں شدّت پیدا ہوگئی۔ ہندوستان کی اندرونی بے چینی — تحریک ترکِ موالات اور جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے روحانی کرب اور اقتصادی بحران نے اس کشمکش کو اور زیادہ بڑھادیا۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات نے زندگی کے بہت سے گوشوں کو متاثر کیا۔ آسکر وائلڈ کے فلسفۂ اصنام پرستی اور ٹیگور کی ماورائیت نے جمالیاتی تصورات کے فروغ کے لئے راستہ زیادہ ہموار کیا اور نوجوانوں کا ایک گروہ حسن کو مقصود بالذات سمجھ کر مسرّت اور حسن پر بہت زیادہ زور دینے لگا۔ اُن کے نزدیک زندگی کا مقصد حصول مسرت کے سوا اور کچھ نہ رہا۔ یہ تحریک اگرچہ مغرب سے آئی تھی۔ لیکن اس میں مغربی افکار کی سنجیدگی نہ تھی۔ بلکہ زیادہ تر توجہ جمالیات کی طرف رہی۔ اس

غلبے نے سماجی احساس سے دوری پیدا کر دی - اور زندگی کی دوسری ضرورتیں پس پشت جا پڑیں۔ " ادب لطیف " کی اس تحریک کے علمبرداروں میں ۔ سجاد حیدر یلدرم ۔ مہدی افادی - سجاد انصاری اور نیاز فتحپوری کے نام بہت نمایاں ہیں -

رومانیت کے یہ پجاری، دراصل انفرادیت - انانیت و جذباتیت اور بغاوت کے طلسم میں اسیر ہو گئے - اُن کی بدولت جہاں عقلیت اور روایت پرستی کا غلبہ کم ہوا - وہیں غیر حقیقی تصورات نے بھی فروغ پایا - نقادوں کا خیال ہے کہ " ان غیر حقیقی تصورات کی واضح مثال نیاز فتحپوری کی تخلیقات میں ملتی ہے "۔ مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں سب سے اہم شخصیت نیاز ہی کی ہے - جنکی بدولت ادب میں لطافت کی چاشنی پیدا ہوئی - اور بہت سی فرسودہ روایات کو صدمہ پہنچا - تقلید کی بندشیں اور زیادہ ڈھیلی ہوئیں —

مغربی افکار سے واقفیت کے باوجود وہ اس سلسلے میں خاصے قدامت پسند ہیں - عربی، اردو، فارسی پر عبور رکھنے کی وجہ سے یہ رجحان اور زیادہ مستحکم ہوا - بلاشبہ نیاز کو شعر و ادب سے بہت دلچسپی رہی ہے - لیکن رومانیت سے شغف کی وجہ سے اُن کی نگاہ شعر کے جمالیاتی پہلو سے آگے نہیں بڑھتی - اسی روشنی میں انھوں نے فکر و فن کے سانچے بنائے اور ایک مخصوص تنقید سے لوگوں کو طویل عرصے تک روشناس کراتے رہے - بہتوں کو ادبی شہرت بخشی -

لیکن بعضوں کو محروم کرنے کی بھی کوشش کی۔ زبان و بیان کی بہت سی لغزشوں کی اصلاح کی اُردو میں حالی کے اثر سے فن کی جو اہمیت کم ہوتی جارہی تھی۔ اور اُسے نظر انداز کرنے کا جو رجحان بڑھ رہا تھا۔ نیاز کی بدولت یہ سیلاب کم ہوا۔ لیکن تنقید جو پھیلاؤ چاہتی ہے وہ اُن کے یہاں پیدا نہ ہو سکا۔ غیر معمولی ذہانت اور علمیت کے باوجود قدامت پسندی اُنھیں قدیم اندازِ تنقید کے تنگنائے سے نکلنے نہیں دیتی۔ اور احساس جمال کی شدت اُنھیں سماجی مسائل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ دراصل نیاز کی تنقیدیں تاثرات اور جمالیات سے مرکب ہیں۔ اگرچہ وہ سماجی مسائل کا ذکر ادب میں لازمی نہیں سمجھتے۔ لیکن وہ جدید خیالات سے واقف ہیں اور اپنے عہد کو خوب سمجھتے ہیں۔ البتہ عوام کے اثرات اور تہذیبی تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

نیاز تنقید میں شاعر کی سوانح حیات۔ زندگی کے نشیب و فراز وماحول۔ خاندانی حالت۔ تعلیم و تربیت۔ بچپن اور جوانی کی منزلیں جن سے وہ گذرا ہے پیش نظر رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ نقاد کی اصلی غرض فنکار کی تخلیق اور ان اسباب و محرکات سے زیادہ ہوتی ہے جو کسی تخلیق کے وجود میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک نقاد کو ان باتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ لیکن تفصیلات کی کچھ حدود ہیں۔ نقاد ان سے اگر آگے بڑھا تو پھر

بہت سی اہم باتوں کو فراموش کر جائے گا۔ اس کا کام صرف زندگی کی عکاسی کرنا نہیں بلکہ اس پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالنا ہے۔ جس طرح ایک فنکار کے ذاتی تجربات جب تک سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہو کر ظاہر نہیں ہوتے۔ اُن میں توانائی نہیں آتی۔ چونکہ اُس کے مخاطب دوسرے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے فنکار کے لئے بھی ذاتی ذوق کے لئے گنجائش بہت کم باقی رہ جاتی ہے۔ اور اسی نسبت سے نقاد کے لئے ذاتی پسند یا ناپسند کا طریقہ بھی مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور نہ تخلیق کو محض فن ورفارم تک محدود کرنا مناسب ہوگا۔

جہاں تک نیاز کی تنقیدوں کا تعلق ہے انھوں نے بہت سے اہم اشخاص پر اہم تنقیدیں کی ہیں۔ اور اپنے خیال میں انھیں زمانے اور ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن اُن کا رحجان اندازِ بیان کی طرف زیادہ ہے۔ وہ شاعری میں یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعی الفاظ سے بھی ادا ہوتا ہے یا نہیں اور وہ سامع کے ذہن تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں۔ یعنی انھیں جذبات سے سروکار نہیں۔ اسی لئے وہ شعر کی ماہیت پر بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"اس میں شک نہیں ... وہ جذباتِ انسانی کو حرکت میں ... کی جذباتی قیمت" ہے جو تصنیف ہمارے ...

ہے وہ یقیناً ادبیات میں داخل ہے۔ خواہ اِس کی کوئی اخلاقی قیمت ہو یا نہ ہو۔" ("ادبیات اور اصولِ نقد"۔ انتقادیات حصّہ دوم)

یا کسی تصنیف یا کتاب کے متعلق یہ بحث کرنا کہ وہ اخلاق کا درس دیتی ہے یا بد اخلاقی کا بالکل لایعنی سی بات ہے۔ اس کے متعلق صرف یہ بحث ہو سکتی ہے کہ وہ " تصنیف ایک تصنیف کی حیثیت سے اچھی ہے یا بُری" آسکر وائلڈ کی یہ رائے جملہ اصناف و تالیف پر حاوی ہو یا نہ ہو لیکن شاعری کے بارے میں یقیناً قابلِ عمل ہے اور میں کبھی شاعری کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے سے بحث نہیں کرتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ " بُری یا بھلی جو ودیعت فطری ایک شاعر کو عطا ہوئی ہے اُس کا استعمال اُس نے دُرست کیا یا نہیں"۔

(ظفر کی شاعری)

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ نیاز کے ذہنی ارتقا میں جمالیاتی حِس کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ اگرچہ شاعری کی کتابیں بیاں اُن کے نزدیک بالاستیعاب پڑھنے کی چیز نہیں۔ یہ تو کبھی فرصت کے لمحات میں دلبستگی پیدا کرنے اور اضمحلال دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ پھر بھی ان کی نظر شعری سرمائے پر گہری ہے۔ اور شعری لطافت انھیں کاروباری دنیاوی اُلجھنوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لئے سکون بخشتی ہے۔ شاعری کا یہ تفریحی پہلو اس بڑھتے ہوئے سماجی شعور کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ غرض نیاز کے یہاں "محبت ملا

عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے۔ اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے .... کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت اُن سے پیدا ہوتی ہے اُس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا کرنے کے لئے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان وضع کئے گئے ہیں۔ پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افرادِ نوعِ انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے۔ لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے اُسی جذبے سے جو جنسی کشش خواہش سے پیدا ہوتا ہے "۔ (انتقادیات ص ۸۶)

ظاہر ہے کہ نیاز کے نزدیک شاعری مقصد کے لئے نہیں ہے اور نہ سماجی و معاشی مسائل کا بیان شاعری میں کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا سب سے بڑا مقصد لذت اندوزی ہے! ہاں شاعر کے دل کی باتیں دوسرے کے لئے پیغام کے طور پر کام آسکتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ آواز قدرے اونچی ہو جاتی ہے سیماب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

" سیماب کی شاعری کا تعلق کارِ امروز سے اتنا نہیں جتنا فسانۂ دیروز سے ہے۔ یعنی جتنی خوبی کے ساتھ وہ کل کی داستان بیان کر جاتے ہیں۔ اتنی خوبی سے وہ آج کے حقائق سے عہدہ برآ نہیں

ہو سکتے۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ ماضی کے نقوش کو تکمیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن حال کی تعمیر کا خاکہ اُن کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ ارضِ تاج کی کھوئی ہوئی عظمت کا مرثیہ تو اچھا لکھ سکتے ہیں، لیکن دوسری ارضِ تاج پیدا نہیں کر سکتے ۔ تغیراتِ زمانہ اور زندگی کی بڑھتی ہوئی الجھنوں نے انھیں سماجی و معاشی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن اُن کی عملی تنقید کا نمایاں پہلو فن اور رفارم سے زیادہ متعلق ہے۔ وہ اسلوبِ بیان کے پرستار ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ الفاظ سے مطلب اَدا ہوا یا نہیں۔ کیونکہ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ جذبات و تاثرات کا اظہار الفاظ کے ذریعے ممکن ہے۔ اور اندازِ بیان ہی ایک وہ چیز ہے جس سے مخاطب کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اور گفتگو کا لب و لہجہ پیدا کرنا مخصوص الفاظ کی مخصوص ترکیب ہی سے ممکن ہے۔ علاوہ اس کے جذبات کی بلندی و سخافت سب الفاظ و اندازِ بیان پر منحصر ہے۔"

نیاز کی تنقید کو پڑھئے تو بعض باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ وہ مغربی افکار و خیالات سے اس فن میں بہت کم فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مغرب کے ہر خیال سے اتفاق کیا جائے یا پھر اصول کو اُردو ادب پر منطبق کر دیا جائے۔ لیکن فنِ تنقید میں مغرب نے جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اس سے کام نہ لینا گویا فن کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ نیاز اپنے آپ کو عموماً مشرقی

اصطلاحات تک محدود رکھتے ہیں اور ساتھ ہی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ کہیں انداز تحسینی ہے اور کسی جگہ تنقیص ہے۔ تحسین و تعریف کی نمایاں مثال اُن کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے نگار کے "مومن نمبر" میں لکھا ہے:۔

"اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ تو میں بلا تامل کہدوں گا" کہ مجھے کلیاتِ مومن دیدو اور باقی سب اُٹھالے جاؤ" میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بہ جبر تسلیم کرا سکتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے اِن دشواریوں کو محسوس کر کے اُصولِ نقد منضبط کئے ہیں وہ بہت محفوظ ہیں۔ اگر اُن پر عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اُن پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کسی خیال پر تنقید کرنے کیلئے، سب سے پہلے اصولِ فطرت پر نظر ڈالنا چاہیئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اسی طرح فیصلے کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق میں مومن کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا" (کلام

مومن پر ایک طائرانہ نگاہ)" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیاز پسند اور ناپسند کے کس قدر قائل ہیں اور کس حد تک قطعیت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں فن نقد کی مستند کتابیں پڑھیے تو کسی جگہ بھی اس کی حمایت نہیں ملے گی۔ بلکہ ایسے اٹل فیصلوں کو فن کا سب سے بڑا نقص بتایا گیا ہے۔ اس اصول کا سب سے بڑا خطرناک پہلو وہ ہے جب نقاد کی یہ ذاتی پسند غلط راستے پر ڈال سکتی ہے۔ اور اس پابندی کی وجہ سے خود نقاد سیدھے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ اور اس کا فن اَدب کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی آرزوؤں اور امنگوں میں اسیر ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں نیاز نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"اگر ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطہ نظر سے دیکھے گا تو یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دے گا"

عام خیال یہی تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ غالباً کوئی نقصان دہ پہلو غزل میں ثابت نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ غزل کے متعلق نیاز کا یہ نقطۂ نظر صدیوں پہلے درست ہو لیکن سرِدست اس کی مقبولیت کے امکانات نظر نہیں آتے غالب اور مومن دونوں نازک خیال شاعر ہیں۔ نیاز نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ غالب کی نزاکتِ خیال کس قدر وقیع اور عموماً بامعنی ہوتی ہے کیا مومن کے کلام میں بھی یہ صنعت ہے یا اُن کی

نزاکتِ خیال محض ایک پروازِ تخیل ہے۔ جس میں گرہیں پر گرہیں، پڑتی چلی جاتی ہیں اور جب بقول ایک نقاد انھیں کھولا جائے تو کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ کلام مومن کا یہ امتیازی وصف گتھیاں ڈالنے کا وصف ہے۔ اس کی اگلی منزل معمہ بازی ہے۔ جسے لطافتِ شعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ مومن کا قیامت خیز اندازِ بیان اور مزاج کی دارفتگی نیاز کو پسند خاطر ہے۔ غالباً مومن کا انتخاب اسی بناء پر کیا گیا۔ اسی ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی کا سب سے خطرناک پہلو وہ ہے جب نقاد اپنے جذبات میں آکر کسی فنکار کو گرانے یا رسوا کرنے کے لئے اپنی رائے پر اڑ جاتا ہے۔ جوش اور جگر کے کلام پر عمل جراحی بھی اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ بلاشبہ نیاز صاحب کی بعض اصلاحیں بہت مفید ہیں سیماب کے اس شعر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

سکوں برسا ہوا اُس کے تبسم سے محبت کا
ہے اُسکی تیوریوں میں موجزن دریا صداقت کا

نیاز صاحب کا اِس پر اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں سکوں برسا ہوا بجائے برستا ہوا کے استعمال کیا گیا ہے۔ جو دُرست نہیں۔ تیور میں خود ہی جمع کا مفہوم ہے اور اساتذہ نے ہمیشہ اس کو جمع کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ علاوہ اس کے تیور ہمیشہ خشونت اور برہمی کے محل پر استعمال ہوتا ہے اور شگفتگی سے اسے

کوئی واسطہ نہیں۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیئے۔

برستا تھا شکوں اُس کے تبسم سے محبت کا
جبینِ صاف پر تھا موجزن دریا صداقت کا

یوں تو نیاز صاحب جوش کے قائل نہیں رہے لیکن موجودہ دور میں جوش کی قادرالکلامی اور شاعرانہ فضیلت کے پیشِ نظر اُن کے کلام کو بطورِ سند پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مصرع ہے ع

ع۔ چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال

بیسویں صدی میں تنقید کا فن نہ مدح ہے نہ ذم بلکہ اس کا کام قدروں کی اشاعت کرنا ہے اور تجربات میں فرق کرنا ہے۔ ادب کے تہذیبی مطالعے میں اِن سے جو مدد ملتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور شعر و ادب سے زندگی سنوارنے کی جو توقعات وابستہ کیجاتی ہیں وہ بھی کچھ ایسی بیجا نہیں ہیں۔ خود نیاز صاحب شعر کو ایک کھلی ہوئی حقیقت تسلیم کرتے ہیں اور فطرت سے اُس کو عُذرا بھی نہیں کرنا چاہتے۔ پھر بھی وہ اسے ذاتی رائے کا پابند بتاتے ہیں۔ وہ شاعری میں موزونیٔ طبع کے قائل ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ موزونیٔ طبع جذبات کو نہایت عمدہ اور واضح الفاظ میں ظاہر کر دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی تکمیل بغیر نقدِ حیات کے ہو سکتی ہے۔ یہ اُصول ایسا بنیادی اور واضح ہے کہ خود نیاز صاحب جب کبھی شاعری کو الفاظ سے علیحدہ اور انتقاد کو

ذاتی رائے سے الگ ہو کر سوچتے ہیں۔ تو وہ خود بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ ہے کہ سب سے پہلے نقاد یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اس فن کی رعایت کس حد تک کی ہے۔ اور اس کے نقطۂ خیال سے کون کون سا حصہ ایک تصنیف کا مکمل یا بے کہا جا سکتا ہے۔

نیاز شاعری کا تعلق ذوق انسانی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری طبیعت کے تمام پوشیدہ اسرار کی حامل ہے۔ انھیں اس بات کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ ہر قوم کی شاعری اس کے اخلاق و عادات اور زندگی کے مختلف مراحل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور شاعری جس کی بنیادی تصورات۔ استعارات۔ کنایات اور تشبیہات پر قائم ہے۔ مگر ان لطیف پردوں کے پیچھے ایک حقیقت موجود ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ نقد شعر کو انتقاد عالیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور لٹریچر کو زندگی کی تنقید کہتے ہیں۔ لیکن تنقید سے مراد تشریح لیتے ہیں۔ کیونکہ تمام باتوں سے باخبر ہو کر کسی تصنیف کے متعلق جو رائے دینا ہے وہ تشریح ہے۔ تنقید کے لئے وہ حد درجہ پاکیزگی ذوق کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ کسی موضوع یا فن سے گہری دلچسپی نہ رکھتا ہو بلکہ عام علمی ذوق رکھتا ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ایک عمومی آگاہی رکھنے والا شخص علم و فن کی کتاب پر نقد کرنے کا اہل ہے۔ اس لئے جو شخص شعر کا پاکیزہ ذوق رکھتا ہے۔ وہی در اصل

نقاد کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ پاکیزگیٔ ذوق پر حد سے زیادہ زور دینا اور دیگر خوبیوں پر زیادہ توجہ نہ دینا۔ دراصل نیاز کی تنقیدوں کو یکطرفہ بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح اُن کی تنقید میں کہیں توصیف اور کسی جگہ تنقیص کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہیں سے جانبداری اور مخالفت کے رجحانات اُن کے یہاں غالب آجاتے ہیں۔ فراق کو آگے بڑھانے میں اور اُن کی شاعری کے محاسن اُجاگر کرنے میں نیاز صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ تعریف اور توصیف اُس وقت تک کوئی بُری شے نہیں جب تک کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ اصول کی روشنی میں کیا جائے۔ لیکن جب نقاد اصول کی سرحد سے گزر کر محض توصیف یا تنقیص کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو تنقید محض صرف گیری رہ جاتی ہے۔ اور اپنی افادیت مشتبہ کر دیتی ہے۔

غرض نیاز کو خواہ ہم بڑا نقّاد نہ مانیں لیکن اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پروفیسر کلیم الدین نے "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں انھیں نظر انداز کر کے اُردو تنقید کے ارتقاء کی ایک کڑی کو چھوڑ دیا ہے۔

تنقیدی رجحانات

اُردو کا قدیم تنقیدی سرمایہ بہت محدود ہے۔ شعراء کے متفرقا اشعار میں کچھ تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر زبان و بیان کی صحت الفاظ کی بندش اور عروض و قافیہ کی پابندی تک محدود ہیں کہیں کہیں نفس شعر کے متعلق بھی معمولی باتیں مل جاتی ہیں۔

ع ــ مستند ہے میرا فرمایا ہوا   یا   درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

اسی طرح میرؔ کی تنقید جراءتؔ کے کلام پر۔ سوداؔ کی منظوم تنقید جو میر محمد تقی کے مرثیہ پر کی گئی وہ بھی فصاحت بیان اور ترتیب الفاظ سے متعلق ہے۔ جہاں تک اُردو شعراء کے تذکروں کا تعلق ہے اُن کی حیثیت بھی نجی اور فنی زیادہ ہے اصولی کم۔ ان تذکروں کی کل کائنات شعراء کے حالات زندگی اور مختصر نقد و تبصرے تک محدود ہے ان میں فن اور زبان کے بارے میں چند مفید نکات ملتے ہیں۔ لیکن شعر کی ماہیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اُن کی یکسانیت اور تاثرات کی کیفیت انھیں وسیع فضا میں پرواز نہیں کرنے دیتی اسی لئے

ان میں اُصولی مباحث بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر سے ادب میں بعض نئی باتوں کا چرچا شروع ہوا۔ تہذیب الاخلاق اور بعض دوسرے اخبارات کی تحریروں انجمن پنجاب کے مشاعروں اور جلسوں سے یہ رحجان بڑھنا شروع ہوا اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد نے کلام موثر کہہ کر جدید شاعری کیلئے راستہ کھول دیا تھا۔ لیکن انھوں نے اس تصوّر کو آگے نہیں بڑھایا۔ جدید رحجانات اور انجمن پنجاب سے منسلک ہونے کے باوجود ان کا تنقیدی نقطۂ نظر زیادہ وسیع نہ ہو سکا لیکن یہ ضرور ہے کہ آبِ حیات کے ذریعہ اُردو تنقید نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اُردو تنقید میں یہ پہلی کتاب ہے جس سے تاریخی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک حروف تہجی کے اعتبار سے تذکرے لکھے جاتے تھے۔ اس طرح اہم اور غیر اہم شعراء کی ترتیب قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

آبِ حیات نے اس بے ترتیبی کو ختم کرکے تاریخی تسلسل کا آغاز کیا۔ شعراء کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا اور ہر دور کی خصوصیات بیان کیں۔ لیکن شعراء کی حقیقی تصویر پیش کرنے کے بجائے انھیں "افسانۂ یاران کہن" بنا دیا۔ نقّادوں کا خیال ہے کہ "آزاد پہلے شخص ہیں جنھوں نے تذکروں کی بے جان اور خشک رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا۔ اب تک اُردو شعراء کے جتنے اردو یا فارسی تذکرے لکھے گئے ہیں اُن میں آرٹ کا وہ شعری نقطۂ نظر مفقود ہے جس کی

ابتدا اس تذکرہ سے ہوئی ہے۔ یہی نقطہ نظر کی تبدیلی آبِ حیات کی ادبی اہمیت کی ضامن ہے۔"

یہ صحیح ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا اسلوب اور اندازِ فکر دونوں جدید دور سے ہم آہنگ نہیں ہیں بلکہ اس کی انشا نے اس کی تنقیدی حیثیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ آزاد نے شاعری کو قدیم رنگ سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور جدید موضوعات کی طرف بھی توجہ دی، تاکہ مضامین عاشقانہ ہی تک بات محدود نہ رہے۔ مگر ان کی ذات سے نظریاتِ شعر میں کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہ آسکی وہ شاعری کی افادیت اور واقعیت کے قائل ہوتے ہوئے بھی اسے "پرتو روح القدس" اور "فیضانِ ربانی" سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن پنجاب کے لکچروں (خاص کر "کچھ نظم کلامِ موزوں کے بارے میں جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے") آبِ حیات اور دیگر تحریروں میں ربط نہ پیدا کر سکے۔ یہ تنقیدی نظریات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں منطقی ربط بھی نہیں ہے۔ ایسی کوششوں کے باوجود قدیم اندازِ فکر کے ڈھرے سے قدم باہر نہیں نکال سکے۔

شعر و ادب کا زندگی سے جو رشتہ ہے اس کا صحیح احساس ہمارے یہاں سرسید اور حالی سے شروع ہوتا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے جو راستہ اختیار کیا اس پر جدید ذہن کی تعمیر ہوئی

حالی کے ذہنی ارتقاء میں غالب کی شاگردی شیفتہ کی صحبت انجمن پنجاب کے جلسوں و مشاعروں میں شرکت اور اس دور کے تمدنی و تہذیبی زوال کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اور اس سے بھی زیادہ سرسید سے ملاقات۔ تہذیب الاخلاق کی تحریریں اور خود ان کی افتاد طبع اثر انداز ہوئیں۔ تحریک سرسید کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہر چیز کو حقیقی اور عملی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ غالباً اُن کے خیال میں قومی انحطاط کو جو اپنی حد کو پہنچ گیا تھا روکنے کا یہی واحد راستہ تھا۔ حالی بھی اس زبوں حالی سے بے حد متاثر تھے۔ مسدس میں یہی احساس شعر کا جامہ پہن کر سامنے آیا، یہ خیالات رفتہ رفتہ پختہ ہو گئے اور ساتھ ہی ان میں تنظیم و ترتیب بھی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری جسے اُردو تنقید میں پہلا صحیفہ اور جدید تنقیدی نظریات کا سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ اس کی عمارت، واقعیت، مقصدیت اور افادیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ چنانچہ مقدمہ میں ابتدا ہی سے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ مقصدی اور افادی پہلو غالب ہے اور اس مقصد کو تقویت پہنچانے کے لئے وہ اپنے تمام علمی ذخیروں کو کھنگال رہے ہیں۔ مشرقی نقادوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ مغربی شاعروں اور نقادوں کے خیالات بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور ان سب کا مقصد یہ ہے کہ اُردو شعر و ادب میں افادی اور مادی نقطہ نظر پیدا کیا جائے۔ قومی ترقی اور تہذیبی برتری کے لئے اس سے کام لیا جائے۔

اُردو تنقید میں یہ پہلا باقاعدہ اور واضح احساس ہے جو حالی کی بدولت ادبی شکل میں آیا اس سے ایک طرف شاعری کا موضوع قصۂ عشق بتاں سے آگے بڑھ کر مُلکی اور ملی مسائل تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف اس کی افادیت اور اہمیت ظاہر ہونے لگی اور اُردو ادب کو قومی فروغ کے لئے بطور حربہ کے استعمال کرنے کی راہ کھلی۔ مقدمہ شعر و شاعری جن اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ شاعروں کا تعلق سوسائٹی کے ساتھ کیا ہے۔ بری شاعری سے سوسائٹی اور لٹریچر کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ اور کس طرح اچھی شاعری اور اچھے اَدب سے قوم اور ملک کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ ادب اور زندگی میں تعلق ناگزیر ہے اس لئے ادبی رجحانات کو ایسے راستہ پر ڈالنا چاہیئے جس سے سوسائٹی کو نہ صرف مضر اثرات سے محفوظ رکھا جائے بلکہ اُس کی ترقی کے امکانات زیادہ وسیع ہوں۔ اس بناء پر حالی شاعری میں مضامین کے دائرہ کو بہت وسیع کرنے کے حق میں ہیں۔ اور اسی وسعت کی خاطر وہ فن کی پابندیوں کو بھی کم کرنا چاہتے ہیں۔ اردو تنقید میں اسی اعتبار سے حالی مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اُن کی اصلاحی تحریک کا مقصد اُردو شاعری کو رفعت اور بلندی کی طرف لے جانا ہے بعض اسباب کی بنا پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی اصلاحات ادبی کم اخلاقی اور مقصدی زیادہ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ادب کا تعلق زندگی سے ہے تو پھر اخلاق سے بیزاری اور دُوری کیوں؟

کیا نظامِ اخلاق میں صالح عناصر کارفرما نہیں ہوتے۔ بار بار حالی کا اخلاق پر توجہ دلانا یقیناً شعر کی لطافت پر بار گزرتا ہے لیکن اس سے اُن کے نظریۂ تنقید کو نامکمل تو کہا جاسکتا ہے یکسر غلط نہیں قرار دیا جاسکتا۔ حالی اخلاق، مقصدیت اور افادیت کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ محدود ضرور ہے لیکن اس سے شاعری کے دائرہ کو پھیلنے میں بہت مدد ملی۔ اپنی کمزوریوں کے باوجود حالی اُردو میں پہلے شخص ہیں جو مذہبی اخلاقی اور اَدبی روایات کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں نئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں ——

غزل کی اصلاح میں انھوں نے سب سے زیادہ اخلاقی نظریہ کو مقدم رکھا۔ اب تک شاعری کو بالعموم تفریح طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور خاص کر غزل کا چٹخارہ کچھ لذّت وکام ودہن کے لئے زیادہ وقعت تھا۔ اور چونکہ "قوم کے لکھے پڑھے اور اَن پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں وجد و سماع کی مجلسوں میں لہو ولعب کی صحبتوں لیں تکیوں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے"

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے یہاں عشق و محبت کی وہ لہک

پائی جاتی جو ندبار کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے ۔ شاید اصلاح کی زعم میں
حالی بہت آگے نکل گئے ہیں اور انھوں نے مقدمہ میں عشق و محبت
کی جو مختلف تاویلیں کرکے اسے افلاطونی تصور عشق سے ملا دیا ہے ۔
اس پر آج بھی لوگ معترض ہیں ۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ حالی
کے تنقیدی نظریات کے طفیل اُردو شاعری میں نئی آوازیں سُنی جانے
لگیں ۔ اور اس نے بحیثیت مجموعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور حیات
و کائنات کے مسائل سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ۔ اُس نے شاعری
کو محض ذہنی سفر تک محدود رکھنے کے بجائے خارجی دنیا کے رنگ سے
بھی آشنا کیا ۔ حالی جذبات سے زیادہ عقلیت الفاظ سے زیادہ معنی
اور مبالغہ سے زیادہ حقیقت کی طرف مائل ہیں ۔

حالی کے نزدیک " شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کے تابع
نہیں لیکن وہ اخلاق کا قائم مقام اور نائب مناب ضرور ہے "
وہ اخلاقیات اور ادبیات میں تضاد کے قائل نہیں بلکہ دونوں میں
ربط دیکھتے ہیں ۔ اس لئے کسی تصنیف یا شعر کے اخلاقی یا غیر اخلاقی
ہونے کی بحث نقاد کے لئے زیادہ اہم ہے ۔ اگر اُس میں ادبیت
کی چاشنی موجود ہے تو اس کی اخلاقی حیثیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا
ہے ۔ چونکہ ادب کا کام جذباتِ انسانی کی ترجمانی کرنا ہے اس لئے
اس کی جذباتی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ مختلف گوشوں
کی سیر کرتا ہے ۔ جیسا کہ سرسید اور حالی دونوں نے اس بات کا

اعتراف کیا ہے کہ مضامین عاشقانہ کچھ ایسے بُرے نہیں لیکن اس کے آگے کی بعض منزلیں ہیں، اِن بزرگوں کا اُنیسویں صدی کی شاعری پہ یہی اعتراض تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی شاعری کے فنی گورکھ دھندوں کو دیکھتے ہوئے یہ اعتراض نامناسب نہیں تھا۔ غرض حالی سے قبل اردو ادب میں اجتماعی نظریات اور قومی تصورات نہیں تھے۔ ان کی بدولت یہ رجحانات داخل ہوئے اور ان کو حالی نے چند اصولوں کے ماتحت منضبط کیا۔ یہ نظریئے اپنے اندر زندگی رکھتے ہیں۔

حالی کے بعد اُردو تنقید میں شبلی کی تنقیدی حیثیت نمایاں ہے۔ انھوں نے بھی حالی کی طرح کہیں کہیں مغربی خیالات سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن وہ مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہیں اور مشرق کے ہی قدیم تنقیدی سرمایہ کے سہارے اپنے خیالات آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ شاعری کو 'ذوقی اور وجدانی' چیز سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک "جو کلام جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے۔ یعنی اس کوشش کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے اس کی یہی خصوصیت اسے دوسرے علوم سے ممتاز کرتی ہے۔ اس نظریہ کو انھوں نے شعر العجم میں اصولی و عملی دونوں حیثیتوں سے پھیلایا ہے اور مشرقی اندازِ فکر، فصاحت و بلاغت، تشبیہہ و استعارہ، صنائع و بدائع اور دیگر لفظی خوبیوں کی طرف زیادہ

مائل ہیں۔ یعنی فنی محاسن پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ گلستاں کی مثال پیش کرتے ہیں جس کے مضامین اُن کی رائے میں اچھوتے اور نادر ہیں۔ لیکن اس کے اسلوب اور طرزِ تحریر کا جادو اسے دلکش بنا دیتا ہے۔ وہ معنی کی اہمیت کے منکر نہیں لیکن اسلوب بیان پر ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے۔ وہ شعر میں اخلاقی پہلو بعد میں اور ادبی پہلو سب سے پہلے تلاش کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا رجحان عربی ادب کی طرف تھا اور فارسی کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ اس لئے ان کے تنقیدی نظریات پر ان زبانوں کے اصولوں کا زیادہ غلبہ ہے شعر العجم موازنہ انیس و دبیر اور سوانح مولانا روم میں یہی انداز تنقید پایا جاتا ہے۔ خاص کر شعر العجم کے چوتھے حصہ میں انھوں نے جو اصولی بحث کی ہے اس کا بیشتر حصہ حالی کے خیالات کی تشریح اور تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ عملی تنقید کے نمونوں میں وہ تشریحی انداز اختیار کرتے ہیں جو قدماء کی روش کا آئینہ دار ہے۔ ان اثرات نے انھیں ادب و شاعری کی سماجی حیثیت کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہونے دیا۔ ویسے وہ تمدن و معاشرت کی تبدیلی اور مقامی حالات کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ کسی ملک کی شاعری کو اس کی خصوصیات کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سب باتیں اُن کے یہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ان کا رجحانِ غالب شعر کے فنی محاسن پر زیادہ رہتا ہے۔ اس لئے بحیثیت نقاد مشرقی بھی ہیں اور مغربی بھی بلکہ دونوں کے درمیان

متعلق ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی فنی و جمالیاتی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ــــــــ

مولوی عبدالحق صاحب بھی محقق اور نقاد دونوں حیثیتوں سے ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں۔ یوں تو وہ محقق پہلے ہیں اور نقاد بعد کو لیکن سماجی، تاریخی اور سیاسی حالات کی روشنی میں اُن کا تنقیدی شعور حالی سے متاثر ہوتا ہے۔ سرسید تحریک اور حالی کی اصلاحی تحریک کا اُن پر گہرا اثر ہے۔ مسدس حالی اُن کے نزدیک شاعری کا بہترین کارنامہ ہے۔ گویا سرسید و حالی کے افادی اور سماجی نقطۂ نظر سے وہ متفق ہیں۔ ان کے یہاں شخصیت اور اس کے ماحول کی بڑی اہمیت ہے۔

انتخاب کلام میر میں انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ اُن کے خیال میں میر کی شاعری اور سیرت ایک ہیں وہ شاعری میں مقامی اثرات اور سماجی حالات کے قائل ہیں اس لئے وہ اُردو ادب کو اس ماحول میں دیکھتے ہیں۔ وہ مغرب سے استفادہ کے قائل ہیں۔ لیکن مغربی اصولوں کو اٹل نہیں مانتے اور نہ اُن پر اردو ادب کو پرکھنے کے حق میں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی سب سے نمایاں وصف تحقیق سے شغف ہے۔ انھوں نے بہت سے پرانے دفینوں کو تلاش کیا اور انھیں شائع کر کے اردو ادب کی تاریخ میں بعض

اضافے کیے۔

عبدالرحمٰن بجنوری بھی ایک جدید رجحان کے ساتھ اُردو دنیا میں داخل ہوئے وہ آج "محاسن کلامِ غالب" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بجنوری دراصل ذہنی تربیت کے لحاظ سے مغربی، اور مزاج کے اعتبار سے مشرقی تھے۔ انھوں نے اپنے دَور کے جن رجحانات کے خلاف احتجاج کیا خود اسی کا شکار ہو گئے۔ انھیں شکایت تھی کہ ہمارے نقاد شعرا کا مقابلہ مغربی شعرا سے کرتے ہیں۔ لیکن خود انھوں نے نہ صرف شعرا کا موازنہ شعرا سے کیا بلکہ مصوروں اور مغنیوں سے کر ڈالا وہ اُردو تنقید میں ایک ترجمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا اندازِ تنقید تحسینی اور تاثراتی ہے لیکن اُن کا اندازِ تحریر عالمانہ اور خیالات و افکار ایک وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے اُردو میں تقابلی مطالعہ کی مثال قائم کی جس پر مغربی علوم فنون کی گہری چھاپ ہے۔ بقول ایک نقاد "غالب کو نفسیاتی اسلوبِ تنقید کی روشنی میں بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا"، لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ بجنوری کی بدولت غالب سے شیفتگی عام ہوئی۔ یہ کام بہت پہلے حالی کی یادگارِ غالب کے ذریعہ پورا ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ کہا جائے تو کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ بجنوری کا محاسن کلامِ غالب والا مضمون غالب کے سہارے نہیں بلکہ اپنی علمیت اور خیال انگیز کیفیت کی وجہ سے زندہ ہے۔

بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم نے مغربی اثرات کی رفتار زیادہ تیز کر دی۔ اسکر وائلڈ کے فلسفۂ اصنام پرستی نے ایک نئے تصور کو جنم دیا اور اردو کے ادیبوں کا ایک گروہ ادب لطیف کی تحریک کا علمبردار بن گیا جن کا مقصد حصول مسرت کے سوا اور کچھ نہ رہا جمالیات کی حد سے بڑھتے ہوئے اس تصور نے ان لوگوں کو سماجی احساس سے دور کر دیا۔ تنقید کے میدان میں سب سے نمایاں نام نیاز فتحپوری کا ہے۔ جنھوں نے انفرادیت و جذباتیت کے اس رحجان کو بہت فروغ دیا اور اسی روشنی میں تمام تخلیقات کا جائزہ لیا گویا وہ اصولوں سے زیادہ اپنے ذوق اور پسند کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ شاعری میں زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس خیال کو صحیح طور پر ادا کر سکا ہے یا نہیں۔ اس طرح اُن کی تنقید نگاری کی بنیاد ذاتی پسند اور طرز ادا سے زیادہ متعلق ہے۔ شعر کی ماہیت اور اس کی سماجی اور اخلاقی حیثیت سے انھیں زیادہ سروکار نہیں۔ ان کے تاثراتی انداز تنقید کی نمایاں مثال مومن پر ان کی تنقید ہے۔ "اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دیدو باقی سب اٹھا لے جائیے" قطعیت اور تاثرات کا یہ لہجہ اب دھیما پڑتا

جارہا ہے جوں جوں شعر و ادب کی تہذیبی حقیقت اور اہمیت ظاہر ہوتی جارہی ہے۔ اصول تنقید بھی زیادہ سائنٹفک اور ہمہ گیر ہوتے جارہے ہیں۔

مغرب کے یہ اثرات منفی اور مثبت دونوں شکلوں میں ہمارے یہاں آئے مغرب سے استفادہ کرنے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جس نے تنقیدی نظریات کو زیادہ مبسوط اور واضح شکل میں پیش کیا اور ان کی کوششوں سے اصولی و عملی تنقید میں بعض مفید اضافے ہوئے۔

مجنوں، فراق، اکرام، سرور، وقار عظیم، احتشام حسین، اور حسن عسکری کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ان حضرات کی بدولت اردو تنقید میں رومانی، اشتراکی، سائنسی اور جمالیاتی انداز تنقید کی کارفرمائی ہوئی اور مختلف علوم و فنون کے اساسی اور بنیادی نظریات کی روشنی میں شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا۔ جس سے ادب میں واقعیت اور حقیقت پسندی کو فروغ ہوا اور ہماری زندگی کے بہت سے اہم مسائل ادب کا موضوع بن گئے ہیں۔

لوگوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اس طرح ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ صالح قدروں کے فروغ کے امکانات بھی زیادہ روشن ہوئے۔ فن تنقید کا یہی سب سے

بڑا اسفدیب اور فرض ہے۔ جہاں تک اُردو تنقید کا تعلق ہے وہ ابھی تک پوری طرح بلوغت کو نہیں پہنچی۔ لیکن اس کی فکر میں گہرائی، نظر میں وسعت اور خیال میں صفائی پیدا ہو رہی ہے۔

تاریخِ ادب کا مُطالعہ

اُردو میں تذکرہ نویسی کی ابتدا شعرائے اُردو کے اُن تذکروں سے ہوتی ہے جو فارسی زبان میں لکھے گئے، یہ تذکرے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے جاتے تھے۔ اُن میں حالاتِ زندگی، نقد و تبصرہ اور انتخابِ کلام سرسری اور مختصر ہوتا تھا۔ ان تذکروں میں کسی تنقیدی شعور کا سُراغ لگنا مشکل ہے۔ زبان کی ابتدائی نشو و نما شاعر کے ذہنی ارتقار اور عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے متعلق بھی یہ تذکرے خاموش ہیں۔ "آبِ حیات" اردو میں پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ہر دَور کی خصوصیات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی انشاء پردازی اور افسانہ طرازی نے اسے افسانۂ یارانِ کہن بنا دیا۔ آبِ حیات سے اُردو زبان میں تذکرہ نویسی کا ایک نیا انداز ضرور سامنے آیا۔ اور اس کے بعد ادبی تاریخوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ تاریخ نویسی کی یہ کوشش اب تک نامکمل اور تشنہ ہے۔ کیونکہ جو تاریخیں لکھی گئیں، وہ ادب کے صرف

ایک رُخ کو پیش کرتی ہیں۔ بعض شاعری تک محدود ہیں اور کچھ محض نثر کے ارتقاء پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اِن تاریخوں میں کاشف الحقائق گل رعنا، سیر المصنفین، ارباب نثر اُردو، تاریخ نظم و نثر اُردو، نمونہ منثورات، شعر الہند، مختصر تاریخ ادب اُردو (اعجاز حسین) تاریخ ادب اُردو (سکسینہ) اور داستان تاریخ اُردو کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اِن کے علاوہ اور بھی تصانیف ہیں جو تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئیں۔ لیکن ان سے تھوڑی بہت تاریخ ادب کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یہ کسی صنف، دبستان یا تحریک کے کارناموں کی تفصیلات سے متعلق ہیں۔ اُن میں نمایاں نام "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ" "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" "دِلی کا دبستانِ شاعری" "اُردوئے قدیم" "دکن میں اُردو" "جدید اُردو شاعری" "ترقی پسند ادب" "اردو تنقید کا ارتقاء" وغیرہ۔ اُن میں سے بعض محض تجزیہ اور تشریح تک محدود ہیں — حالاتِ زندگی اور شخصیتوں کے ارتقاء سے انھیں بحث نہیں۔ لیکن اُن کا تحقیقی و تنقیدی مواد قابلِ قدر ہے۔ کسی ادبی تاریخ کی تکمیل میں ان سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

بیسویں صدی میں ادب کا مطالعہ اقدار کا مطالعہ ہوگیا ہے اس لئے تاریخ ادب کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور

شعراء کے حالات زندگی پر اب تک جس قدر زور دیا جاتا رہا ہے وہ کافی نہیں بلکہ شخصیت کا ارتقاء اور اس کے ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ آج کے مؤرخ ادب یہ دیکھتا ہے کہ ایک فن کار اپنی تخلیقات کو کن حالات میں پیش کرتا ہے۔ اس کے زمانے میں تصنیف و تالیف کا کیا رجحان تھا۔ اپنے پیشروؤں اور ہم عصروں سے اس نے کس حد تک اثرات قبول کیے اور کہاں تک اپنی قوتِ نقد سے کام لے کر ادبی اجتہاد کے لیے راستہ ہموار کیا۔ وہ کس حد تک اپنے دَور کی نمائندگی کرتا ہے اور کہاں تک اس سے مختلف ہے۔ کن اسباب کی بنا پر اس نے اختلاف کیا اور اس میں وہ کہاں تک کامیاب رہا۔ آج ہم اس سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں اور کس حد تک ہماری رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اب مؤرخ ادب کو محض شعر و ادب کے ظاہری پہلوؤں کو نہیں دیکھنا ہے۔ بلکہ اس کے باطن تک پہنچنا ہے۔

اردو ادب کی ترقی تقریباً دو سو سال سے شروع ہوئی ہے۔ اس سے قبل جو کچھ ہے وہ محض تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دَور میں اردو کا سرمایہ صوفیائے کرام کے اقوال اور قصوں کہانیوں تک محدود تھا یہ زبان کے ابتدائی نمونے ہیں جو ہمارے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ لیکن یہی چراغ تھے جو آگے چل کر زیادہ روشن ہوئے۔ اس دَور میں فارسی اثرات اس قدر غالب تھے کہ اردو کے دورِ اوّل کے شعرائے فارسی کی لَے سے لَے ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اور اپنی جدت و اختراع کے باوجود ان کے اثرات سے باہر نہیں نکل پاتے۔ ایک عرصہ تک گویا اردو فارسی کے پروں سے اُڑتی رہی، شاعری سے قطع نظر تذکرہ نویسی کی روایت فارسی میں بھی زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی۔ کم از کم ہندوستان تک جو روایت منتقل ہوئی ہے وہ "لباب الالباب" (عوفی) "تذکرہ دولت شاہ سمرقندی" اور تذکرہ "مجمع الفصحا" سے آگے نہیں بڑھتی۔ شعرائے اردو کے تذکرے دراصل انھیں کی نقل ہیں۔ عربی زبان میں تاریخ و تذکرے کا میدان فارسی سے زیادہ وسیع تھا۔ طبقات الشعراء (جو اس کے ابتدائی دور کی یادگار ہے) میں بھی زمانہ، مرتبہ اور اصنافِ سخن کا تصور ملتا ہے۔ اور بعد میں شعر کی ماہیت پر بھی بحث ملتی ہے۔ جیسے ابن قتیبہ کا "الشعر والشعراء" انیسویں صدی میں مغربی اثرات کی وجہ سے عربی میں ادبی تاریخ کو سیاسی اعتبار سے مرتب کیا جانے لگا۔ مغرب کا یہ رجحان "نکلسن" کی "عربوں کی ادبی تاریخ" اور جرجی زیدان کی "ادب اللغۃ العربیۃ" میں ملتا ہے۔ اصنافِ سخن پر علیحدہ علیحدہ تبصرے بھی کیے گئے، جیسے بنو امیہ کے دور کی غزل اور بنو عباس کے زمانے کی غزل۔ اس طرح ایک عہد سے دوسرے زمانے کی تمام ترقیوں اور تبدیلیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ فارسی میں جہاں تک ہندوستان و پاکستان کا تعلق ہے۔ پروفیسر براؤن کی ایران کی ادبی تاریخ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ دراصل براؤن کی تاریخ تمدنی اعتبار سے مرتب

کی گئی - یہ علمی ادبی تاریخ ہے - لیکن ادبی تاریخ کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ادبی زیادہ ہو تاریخی کم - اُردو میں مولانا شبلی کی شعر العجم بھی بہت مقبول ہے - اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ یہ محض حالات و واقعات اور انتخاب کلام کا مجموعہ نہیں - بلکہ مذاقِ شعری اور لطافتِ خیال کا شاہکار ہے - یہاں واقعاتِ زندگی کی مدد سے شاعر کی شخصیت اور اس کی ذہنی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے جس سے ہمارے مذاقِ شعری کو سنورنے میں مدد ملتی ہے -

اُنیسویں صدی میں اُردو کی ادبی حیثیت زیادہ نمایاں ہونا شروع ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد میں اس میں اہم تبدیلیاں ہوئیں - مغربی اثرات زیادہ تیزی سے پھیلنا شروع ہوئے - اور علی گڑھ تحریک نے اسے بعض نئے رجحانات سے رُوشناس کرایا - ادب اور زندگی کا مسئلہ خاص طور پر زیرِ بحث آیا - مقصدیت، افادیت، حقیقت اور واقعیت کے مفہوم واضح طور پر سامنے آئے اور ادب و زندگی کے رشتے کی تلاش شروع ہوئی - شعر و شاعری کے ساتھ فنِ تنقید نے بھی قدم آگے بڑھایا - حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو اس سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل ہے - اُن کے یہاں پہلی مرتبہ چند مغربی فنکاروں کا تذکرہ کیا گیا - سر سید نے بھی تہذیب الاخلاق میں ملٹن اور شکسپیئر کا ذکر کیا - لیکن حالی نے بعض مغربی رجحانات کو واضح کرنے کی

کی اگرچہ یہ کوشش نامکمل اور ناقص تھی۔ تاہم مغربی ادبیات سے
استفادہ کرنے کی ایک شعوری کوشش یہیں سے شروع ہوئی۔
اس کا اثر یہ ہوا کہ ادبی ترقی کے لئے ایک نیا راستہ کھل گیا۔
لیکن جہاں تک تاریخ ادب کا تعلق ہے اس میں مغربی اثرات
زیادہ داخل نہ ہو سکے۔ فرانسیسی مورخ ادب ٹین کا ذکر دو
ایک جگہ ملتا ہے :۔

(دیکھئے "ادبی تاریخ کے اصول" از ظفر الاحسن لاری، رسالہ
ہندوستانی الہ آباد۔ اپریل ۱۹۳۳ء "تاریخ ادب کا مطالعہ" مظفر علی
صحیفہ لاہور ۳)

جس نے یہ واضح کیا کہ انگریزی ادب پر ماحول کے اثرات نمایاں ہیں
یعنی ادب کی تخلیق کا سراغ تاریخی اور معاشرتی حالات میں
لگانا چاہیئے۔ ٹین۔ نسل ماحول اور لمحے کو بنیادی حیثیت
دیتا ہے۔ اس کے خیال میں کسی فنکار کے کلام کا جائزہ لیتے وقت
خاندانی خصوصیات اور اس کے ابتدائی حالات کا جاننا ضروری
ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ خارجی ماحول نے فن کار پر
کیا اثرات ڈالے وہ اپنے دور میں کئی اشخاص سے متاثر ہو
اور دو اشخاص ایک ہی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود
متضاد راستوں پر کیوں گامزن ہوئے۔ ٹین کا یہ نظریہ انیسویں
صدی میں مقبول ہوا۔ لیکن اس نظریئے کی رو سے معاشرتی

حالات کا جاننا جس قدر ضروری سمجھا گیا ہے وہ بحث طلب ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانے میں دو فنکار اپنے ماحول عہدِ حاضر کی تحریکات سے علیحدہ رہ کر اپنا الگ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر بھی انھیں قبولِ عام حاصل ہوتا ہے اُردو میں اس کی واضح مثال محمد حسین آزاد اور فصیح الملک داغ کی ہے اگرچہ بعض نقاد آزاد کو سرسید کے اثرات قبول کرنے والوں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن آزاد کو شہرتِ عام "آبِ حیات" اور "نیرنگ خیال" کی وجہ سے حاصل ہے۔ اور یہ کتابیں سرسید کے اثرات سے آزاد ہیں۔ حالی کے جب تک دم میں دم رہا قوم کے اقبال کا ماتم کرتے رہے۔ لیکن داغ ایک آہِ سرد کھینچ کر ہمیشہ کے لئے حسن و عشق کی دنیا میں کھو گئے۔ فردوسی عرفی اور غالب کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو شاہی دربار سے اُن کی راہ و رسم محض رسمی نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ماحول سے کوئی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن اچھے فنکار کی انفرادیت اپنے گرد و پیش سے کچھ دیر کے لئے بے نیاز ہو کر ہمیشہ الگ راستہ نکال لیتی ہے۔ فن کار ماحول سے جو کچھ حاصل کرتا ہے اُس سے زیادہ وہ معاشرے کو واپس کر دیتا ہے۔ یہی اسکی انفرادیت ہے، جدید دور کے مورخِ ادب کا فرض یہ ہے کہ اس اختلاف کا سُراغ لگائے۔ اور شاعر کی انفرادیت کا مطالعہ نفسیات کی روشنی

میں کرے۔ اور اسی فرق کو واضح کرے جو دو فن کاروں میں ہوتا ہے۔ اور ادبی تاریخ کو ایسے سانچے میں ڈھالے کہ تاریخ کے سارے اجزار ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوں۔ در اصل تاریخ ادب کا مطالعہ ذہنی، ادبی، تمدنی اور لسانی مطالعہ ہے اس طرح ادب کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور اس کا وسیع تصور اور تہذیبی اہمیت حیثیت سامنے آسکتی ہے۔

مضامینِ چکبست (ایک تعارف)

اردو شاعری میں چکبست کی وطنی اور اصلاحی نظموں نے خاصی قبولیت حاصل کی۔ " نثر میں وہ معرکۂ چکبست و شرر کی وجہ سے مشہور رہے لیکن فن تنقید کے نقطۂ نظر سے اس معرکہ کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے اس کا انداز شخصی اور ذاتی زیادہ ہے۔ علمی اور ادبی کم، یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات دیرپا ثابت نہیں ہوئے۔ مضامین چکبست کا دائرہ کچھ زیادہ وسیع بھی نہیں ہے نہ ان میں تنوع ہے نہ موضوعات کی رنگا رنگی۔ کچھ مضامین کشمیری پنڈتوں کے سرسری حالاتِ زندگی اور کمالاتِ علمی و ادبی کے تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ اودھ پنچ اور اس کے جادو نگار مضمون نگاروں سے متعلق ہیں لیکن داغ دہلوی۔ دیباچۂ گلزارِ نسیم، اودھ پنچ اور رتن ناتھ سرشار، یہ مضامین قابل توجہ ہیں۔ موجودہ اردو تنقید چکبست کے خیالات سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ تاہم اُن کے مضامین سے بیسویں صدی کی تہذیبی کشمکش نئی اور پرانی قدروں کا تصادم

اور اس کے اثرات نیز اس دور کے ادبی رجحانات اور لکھنؤ اسکول کے نظریہ شعر و ادب کے سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ مضامین چکبست کا مطالعہ اس روشنی میں مفید ہوگا۔

ہندو مسلم دونوں تہذیبوں کی بہترین روایات کو اپنانا۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنا اور انھیں زندگی میں برتنا کشمیری پنڈتوں کی خصوصیت رہی ہے۔ ذہنی وسعت، فراخ حوصلگی اور مذہبی رواداری کی بدولت یہ لوگ ہر دور میں معزز و محترم رہے چکبست کا جس نسل سے تعلق تھا اس پر مسلمانوں کی تہذیب کے اثرات موجود تھے۔ اور ان میں مسلمانوں کے علوم و فنون کا چرچا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات عام ہو رہے تھے مگر اس کی مخالفت کا طوفان ابھی تھما نہیں تھا۔ اودھ پنچ اس تحریک کا بہت بڑا مخالف تھا۔ وہ تہذیبی معاملات میں قدامت پرست لیکن سیاسی معاملات میں کانگریس کا ہمنوا تھا۔ چکبست کی ذہنی تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ بدلتے ہوئے حالات نے انھیں جدید تعلیم کی طرف مائل کیا لیکن وہ اس رنگ کو پوری طرح قبول نہیں کر سکے۔ ان کا گھریلو ماحول اور مزاج مشرقی تھا۔ اسی لئے چکبست کے یہاں قدیم و جدید کے ملے جلے احساسات نظر آتے ہیں۔ اور اصلاح و ترمیم کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اودھ پنچ کی نسبت لکھتے ہیں " اودھ پنچ کا وطیرہ زمانہ شناسی کی رفتار سے الگ تھا اس نے علی گڑھ کے پولیٹکل مسلک کی

مخالفت نہیں کی بلکہ سرسید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو شعاعیں نکلیں ان پر خاک ڈالنے کی کوشش کی۔ علی گڑھ کالج کو لامذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو "پیر نیچر" اور "نیچریہ مذہب" کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔" یہ جدید تعلیم کا اثر تھا ورنہ انکے خیالات ورجحانات کا اصلی رنگ یہ ہے :-

"ان لوگوں کو جنھوں نے نئی تہذیب میں نشو و نما پائی اور جو تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہیں۔ پرانی روشوں میں سوائے عیوب کے اور کوئی جوہر نظر نہ آئے مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس زوال کی حالت میں بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے۔ جس کا رنگ ابھی بالکل نہیں اڑ گیا ہے۔ باوجود ہزار عیوب کے یہاں باشندوں کے طرز معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے جو کہ بیرون جات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں زبان کی شستگی طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ حسن تقریر تو گویا شرفا لکھنؤ کی گھٹی میں پڑے ہیں۔"

اودھ پنچ کی آواز اپنے دور میں بہت اونچی اٹھی اور اس نے بہت سے صحت مند تصورات و خیالات کو دبا دیا جن کی اس زمانے میں سخت ضرورت تھی یعنی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے اور تہذیب معاشرت کی اصلاح میں تہذیب الاخلاق نے جو کارنامہ انجام دیا، اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اودھ پنچ نے اس نئی

صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا ہتھیار استعمال کئے اور کس حد تک راہ ہموار کی۔ اس دَور کی تہذیبی زندگی کے مطالعہ میں اس سوال کی بڑی اہمیت ہے۔ مضامین چکبست کے مطالعہ سے یہ گتھی نہیں سلجھتی۔

داغ دبستانِ دہلی کے بڑے غزل گو شاعروں میں ہیں اُن کی شاعری کی نسبت بہت کچھ لکھا گیا۔ چکبست نے بھی داغ کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔ یہ مضمون اگرچہ لکھنؤ اور دہلی کی رقابت کا بالکل شکار نہیں ہوا لیکن اودھ پنچ کے اثر سے آزاد بھی نہیں ہے۔ اگرچہ چکبست نے اودھ پنچ کی تنقید کو ناانصافی پر محمول کیا ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر انکے یہاں اس کے اثرات داخل ہو گئے ہیں۔ کلامِ داغ کا تجزیہ اس احساس کے ساتھ شروع ہوتا ہے " داغ کے شاعرانہ وقار کی کشتی اس وقت تحسین ناشناس اور نفرینِ بیجا کے دوآبہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور ایک عجیب طوفان اس کے گرد برپا ہے.......... بالفعل اس نامور شاعر کے کمال کا بے تعصبی کے ساتھ اندازہ کرنا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے....... لیکن انصاف پسندی اور بے تعصبی وہ اسم اعظم ہے جو مسافرِ تحقیق کو ضرور منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے " اگرچہ فصیح البیانی اور وقار الکلامی کے اعتبار سے داغ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی اور اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف عام طور پر کیا جاتا تھا لیکن جس طرح ایک طبقہ اُن کا مداح تھا اسی طرح مخالفین کا بھی

ایک گروہ تھا۔ اہلِ لکھنؤ کی طرف سے اُن پر اعتراضات ہوتے رہتے تھے حکیبست کا رویہ دونوں سے الگ تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ "یہ شوخ طبع شاعرانہ اس معراج کا مستحق ہے جو تحسین ناشناس کی بدولت اسے اکثر نگاہوں میں حاصل ہے۔ نہ یہ غریب اس فنعر بے کمالی میں پڑا ہے جس میں اس کے بیدرد اور کم نظر مخالف اس کو ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔"

بحیثیت مجموعی چکبست کی نگاہ میں داغ کی شاعری 'عیاشانہ' ہے جو جذبات حیوانی اور نفسانی خواہشات کی تصویر و تفسیر ہے انداز بیان کے اعتبار سے بھی داؔغ کی تشبیہات و استعارات پیش پا افتادہ ہیں۔ ان میں وہ نفاست نہیں جو آتشؔ، ذوقؔ اور انیسؔ کا طرۂ امتیاز ہے اور وہ "جوہر عالی جو شاعرانہ زبان کی جان ہے داغ کی زبان میں موجود نہیں" بعض محاورات کا استعمال بھی غلط ہوا ہے، لیکن داؔغ کی شاعرانہ عظمت کو سرے سے نظر انداز کر دینا ادبی انصاف نہیں۔ داؔغ اور امیر کے معاملہ میں چکبست داغ کے طرفدار ہیں اور داغ کو حقیقی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اُن کا مذاقِ سلیم اور اصلاحی رجحان داغ کی شوخیوں اور ہوسناکیوں کی تاب نہیں لا پاتا وہ شعر میں لطافت اور پاکیزگی ڈھونڈتا ہے اور گدازِ عشق اور سوز و ساز کا متلاشی ہے لیکن داغ کے کلام میں شوخی، چھیڑ چھاڑ اور لغزشِ مستانہ ہے جو اُسے عشقِ حقیقی سے محروم کر دیتی ہے اس کے

یہاں عشق کا تقدس معصومیت اور ضبط نہیں۔ لیکن اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ " داغ کی بدولت تغزل میں حقیقت شناسی اور للاکاری کا رجحان عام ہوا۔"

شعرائے لکھنؤ میں دیا شنکر نسیم اپنی مشہور "مثنوی گلزار نسیم" کی بدولت خاص شہرت رکھتے ہیں۔ چکبست نے ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم کا ایک نیا ایڈیشن اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ جس میں مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم کا مقابلہ کرتے ہوئے دونوں کا مرتبہ متعین کرنا چاہا۔ مثنوی میر حسن کی بے ساختگی روانی اور سادگی کو سراہا اور مثنوی گلزار نسیم میں الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعاروں کی نزاکت، نازک خیالی اور بلند پروازی کی فضا ملتی ہے۔ ایجاز و اختصار تناسب لفظی اس کی مخصوص صنعت ہے۔ لیکن اس بحث کا دلچسپ پہلو وہ ہے جہاں چکبست نے حالی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں " مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے۔" شبلی اور آزاد کا بھی سہارا لیا ہے۔ جہاں تک آزاد کے قول کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ " اس کی عام و خاص سب میں شہرت ہے اس کے نکتے اور باریکیوں کو لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اس پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں۔" آزاد نے اس کی شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن مزید جو کچھ کہا ہے وہ مثنوی کی تعریف نہیں

اس کی بے ربطی اور ابہام کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ شبلی بیشک حالی کی رائے کو بے رحمی پر محمول کرتے ہیں لیکن حالی نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ بہت وزنی ہیں۔ مثنوی میں ربط و تسلسل اور بہاؤ لازمی امر ہے۔ انھوں نے مثنوی گلزار نسیم سے ربط اور تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ اشعار کا حوالہ دیا ہے۔

خوش ہوتے ہی تھے طفل مہ جبیں سے | ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو | پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

چکبست نے کہیں کتابت کی غلطی اور کسی جگہ صحیح اور غلط نسخہ کا حوالہ دے کر حالی کے اعتراضات کو رد کرنا چاہا ہے۔ لیکن بقول ایک نقاد " پنڈت صاحب کو جوش حمایت میں اتنا خیال بھی نہ رہا کہ صحت سے شعر اور بھی خاک میں مل جاتا ہے اور اس کی رہی سہی حیثیت بھی جاتی رہتی ہے۔ ہوتے ہی کا لفظ قابل غور ہے۔ خوش ہوتے ہی یہ ثابت ہوا یعنی خوش ہونا علت ہے ثابت ہونے کی جو بالکل مہمل ہے۔ ایسی صحت سے جو پہلی غلطی ہے اچھی ہے۔ پنڈت صاحب نے فضول صحیح نسخوں کی تلاش میں سرگردانی و پریشانی اٹھائی۔ دوسری بیت میں ایک اور لفظ قابل اعتراض ہے۔ جس سے مصنف کی زباندانی پر بڑا حرف آتا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کی نظر نہیں پڑی۔

ع۔ پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو

اس مصرع میں اسی کا لفظ بڑا لطف دے رہا ہے۔ بجائے (اس کے) اسی کی

کیا ضرورت تھی جو بالکل روزمرہ کے خلاف ہے"

(معرکۂ چکبست و شرر صـ۱۹۹ — ۱۹۸)

مولوی عبدالحق نے بھی تذکرہ گلشن ہند کے مقدمہ میں شکایت کی ہے کہ " مولانا حالی نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں لیکن اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کچھ تعلق نہیں " حالی کا مقصود صرف یہ تھا کہ مثنوی میں ربط اور تسلسل کا ہر حال میں خیال رکھا جائے اور کسی واقعہ کے بیان میں مضمون آفرینی و بلند پروازی کی ضرورت نہیں ہوتی جو کچھ کہا جائے صاف اور واضح الفاظ میں کہا جائے تاکہ تسلسل میں فرق نہ آئے اور ایک بیت دوسری بیت سے ملتی چلی جائے۔ نسیم اس رنگ کو نہیں نبھا سکے۔ بلاشبہ نسیم نے اختصار کو ایک صنعت بنا دیا لیکن مثنوی کی روانی کو ختم کر دیا وہ تناسب لفظی اور فنی باریکیوں میں الجھ گئے۔

چکبست نے ان اعتراضات کا جو جواب اردوئے معلی میں لکھا تھا اس میں نہ صرف حالی کے اعتراضات کا جواب دیا بلکہ ان کی جدید ادبی تحریک اور شاعری پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ " مجھ کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا موصوف اصول شاعری سے بے خبر ہیں نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار میں مفقود

ہیں۔ پھر ان کو بے معنی کہنا چہ معنی دارد وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیاں قائم نہیں رہتی ہیں۔ لہٰذا آپ خیال کرتے ہیں کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت سادہ نظم کر دی جائے اور اس خیال کے موافق اُردو کے جن اشعار میں نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی پاتے ہیں اور اس کو بے معنی اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ لکھنؤ والوں کی بھی حالی اور ان کی تحریک کی نسبت یہی رائے تھی۔ اور اسی رجحان کی بنا پر حالی کی تحریروں پر اعتراضات کا سلسلہ چلتا رہا۔ مقدمہ کی اشاعت سے اس میں اور شدت پیدا ہو گئی اور اسی سلسلہ کے تمام مباحث اسی رنگ میں رنگ گئے۔ چکبست اور دیگر نقادوں کی تحریروں میں افراط و تفریط زیادہ ہے۔ تعمیری اور اصلاحی پہلو بہت کم ہے۔ مگر چکبست کو ان میں یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ مدلل اور سنجیدہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ اور حتی الوسع قلم کو ذاتیات سے آلودہ نہیں کرتے۔

مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت کے بعد لکھنؤ میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ مولانا حالی نے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی ہیں اس کا بیشتر حصہ شعرائے لکھنؤ کے کلام سے

لیا گیا ہے۔ یہ لکھنؤ ی شعراء کی توہین سمجھی گئی۔ اس لئے بقول چکبست "مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ مدت تک جاری رہا۔" چکبست نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ 'اُردو شاعری' پر انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں ماضی کی قدروں کو نظر انداز کرنے کا ماتم کیا ہے اور اپنی تہذیب و معاشرت کو اپنانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چکبست کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے کہ مغربی تہذیب و تقلید کے سیلاب میں انھوں نے اپنی روایات اور اقدار کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس کا خوشگوار اثر ہوا۔ آج جدید نسل مشرق و مغرب قدیم و جدید کی متلاشی ہے اس رحجان کا پیدا ہو جانا یقیناً ایک نیک شگون ہے۔ وہ بار بار مغرب کی ذہنی غلامی پر احتجاج کرتے ہیں:۔

"اس دماغی اور روحانی غلامی نے طبیعتوں کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمراں قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے، قومی وقار کا سودا ہمارے سروں سے رخصت ہو گیا۔ اکثر صورتوں میں ہمیں اپنے اخلاق و مذہب سے بھی شرم آنے لگی اس قومی بے خبری کے عالم میں ہمیں اپنے قدیم ادب یا لٹریچر سے بھی حجاب آنے لگا۔ انگریزی زبان میں کمال پیدا کرنا تعلیم و تربیت کا معیار ہو گیا۔"

"انگریزی تعلیم نے ملک میں رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے

اُسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے مگر اس تعلیم کا ایک صریحی اثر ہمارے قومی اخلاق پر بہت خراب پڑا وہ یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعہ معاش ہو گئی۔"

"یہ خیال عالمگیر ہو گیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا برُے بھلے الفاظ میں نظم کر لینا معراج شاعری ہے جذبات کی لطافت کا خیال نظر انداز ہو گیا ہے۔ زبان کے نغمے سے کان ناآشنا ہو گئے۔ محض ننگے بوچے خیالات کی تصویریں کاغذ کے صفحوں پر نظر آنے لگیں۔"

"اُردو زبان پر مولانا حالی کا جو احسان ہے اس کی یاد دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہیئے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ مگر اپنے انگریزی داں احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اُردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اس عیب سے خالی نہ تھے جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے .... ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی نے اُردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اُصول اصلاح میں مدِ نظر نہیں رکھا۔"

حالی کی اصلاحی تحریک کی جو خامیاں اور خوبیاں ہیں وہ اب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن مغربی یا کسی غیر ملکی شاعری سے استفادہ

کرنے کی اس طرح مخالفت کرنا اور محض اپنی بنائی ہوئی دنیا تک محدود رہنے سے ممکن ہے کہ جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچ جائے لیکن اپنی شاعری میں شادابی اور تر و تازگی پیدا ہونے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ حالی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ٹھہرے ہوئے پانی میں حرکت پیدا کر دی اور مشرقی و مغربی اقدار میں اشتراک و رابطہ کی تلاش کرنے کی کوشش کی او دھ پنچ اور اس کے معتقد یہ سمجھتے رہے کہ اس کی چمک سے حالی کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ لیکن حالی کی سادگی اپنا کام کر گئی۔ اور بقول مولانا عبدالماجد دریاآبادی "اس ساری دھوم دھامی کڑاک گرج کا کہیں نام و نشان بھی باقی ہے۔" آج بے خبروں کو خبر ہو گئی ہے اردو شاعری کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

چکبست کا نثر میں کارنامہ کچھ زیادہ نہیں۔ ان کے افکار کی دنیا بھی زیادہ وسیع نہیں۔ لیکن ایک محدود دنیا میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے مضامین میں بہت سی مفید باتیں کہی ہیں اگرچہ وہ ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ اور ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہیں لیکن انھوں نے نئی دنیا کا بھی استقبال کیا اور پرانی دنیا سے بھی رشتہ منقطع نہیں کیا۔ نئے خیالات کو احتیاط کے ساتھ قبول کرنے پر زور دیا۔

اُن کی تنقیدوں میں وسعت اور گہرائی نہیں نہ جامعیت

ہے اور نہ زیادہ رفعت پھر بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں دلکشی بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ اُن کی نثر کی پاکیزگی اور شگفتگی بھی قابلِ ستائش ہے، غرض انھوں نے جو کہا ہے اُس میں نفاست اور سلیقہ پایا جاتا ہے یہی اُن کے مضامین کی افادیت ہے۔

اُردو نثر میں خطوطِ غالب کی اہمیت

مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ "مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی نثر کی اشاعت سے ہوئی ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثرِ فارسی سے نہیں ہوئی" شیخ محمد اکرام کا بھی یہی خیال ہے کہ اُردو خطوط نے اُردو فارسی شاعری کے مقابلے میں جلد قبولیت عامہ حاصل کر لی۔ آج جب کہ جدید نفسیات کی روشنی میں غالب کے کلام کے نئے نئے پہلو سامنے آ رہے ہیں اور ان کی شاعرانہ عظمت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے تو اِس مقبولیت اور دلپسندی کے پیشِ نظر حالی کا فیصلہ شاید جدید نسل کو کچھ زیادہ درست نہ معلوم ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب جیسے بے نظیر شاعر ہیں ویسے ہی بلند پایہ نثر نگار بھی۔ نثر میں غالب کا سرمایہ صرف وہ خطوط ہیں جو دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کے نام لکھے گئے۔ جن میں دلی کیفیات کو ایک سیدھے سادے اور بے تکلف انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس سادگی میں جو حُسن اور تاثیر ہے وہ شاید ہی اُردو کے کسی نثار کو

میسّرآئی ہو۔ مرزا کے بعد بہت سے لوگوں نے اس طرزِ خاص کو اپنانے کی کوشش کی لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ گویا یہ اندازِ تحریر مرزا ہی سے شروع ہوا اور اُن ہی کی ذات پر ختم ہو گیا۔ وُہ اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ مرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں "میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بیٹھے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ مرزا کی انفرادیت یوں بھی ہمیشہ تقلید سے گریزاں رہی ہے۔ اور اسی جذبے نے انھیں اردو خطوط نویسی میں ایک طرزِ خاص کی بنا ڈالنے پر متوجہ کیا۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ مرزا نے جس طرزِ خاص کے ایجاد کرنے کا دعویٰ کیا ہے وہ حقیقت سے زیادہ اُن کی انانیت اور منفرد شخصیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا سے قبل ہی ماسٹر رام چندر نے اپنے رسالہ 'محب ہند' میں قدیم آداب و القاب اور پُر تکلف عبارت سے ہٹ کر ایک سادہ اور صاف اندازِ بیان اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی اور کیا عجب ہے کہ مرزا نے یہ طرزِ مخصوص وہیں سے اُڑایا ہو۔ اِس بحث سے قطع نظر قابلِ غور بات یہ ہے کہ مرزا نے یہ اثرات کہیں سے لیے ہوں لیکن اُنھوں نے اسے جس طرح نبایا اور اس میں جو سدا بہار کیفیت پیدا کی وہ انھیں کا حصّہ ہے اور ان خطوط کی وجہ سے اُردو نثر میں نہ صرف ایک مخصوص اندازِ تحریر اور اسلوب کا اضافہ ہوا بلکہ اُردو نثر کی تاریخ

ایک نئے راستے سے روشناس ہوئی۔)

اُردو میں نثر مغربی اثرات کی رہینِ منت ہے۔ سیاسی انقلاب نے زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا اور زندگی میں نئے رجحانات داخل ہونے سے زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں اور نئی نئی ضرورتوں نے جنم لیا۔ مقصدِ زندگی وسیع ہوا اور اس کے تقاضے پھیلتے گئے۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آئی۔ ظاہر ہے کہ خیال کی اشاعت نثر ہی سے ہوسکتی ہے۔ لیکن ہماری سیاسی سماجی زندگی میں جس رفتار سے تبدیلی ہورہی تھی اس رفتار سے ہمارے یہاں ادبی تصورات نہیں بدل رہے تھے بلکہ زیادہ تر شاعری کا چرچہ تھا اور نثر کی طرف سے بالکل غفلت برتی جارہی تھی۔ اور جو کچھ نثر کا سرمایہ موجود تھا اس پر تکلف اور تصنع کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اور عبارت آرائی کے شوق میں اصل مقصد کا خون کردیا جاتا تھا۔ گویا اظہارِ مقصد سے زیادہ علمی نمائش مقصود تھی اور خیال کی وضاحت سے زیادہ شاعرانہ استعاروں اور اشاروں کی طرف توجہ تھی۔ حالانکہ نثر کا اصل مقصود وضاحت اور صراحت ہے جس میں جذبے کے بجائے خیال کا حُسن بنیادی چیز ہے اس میں منطقی استدلال اور ترتیب مضمون کو اوّلیت حاصل ہے۔ اس اُصول کی روشنی میں اگر قدیم اُردو نثر کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے (ہر چند اُردو میں سادہ نثر کا آغاز میر امن سے

ہوا لیکن میر امن کے قصے اور کہانیاں اوّل تو ترجمے ہیں۔ دوسرے فورٹ ولیم کالج کے مقاصد کے لیئے وجود میں آئے۔ اُن کی وہ مستقل حیثیت نہیں ہے جو مرزا کے خطوط کو حاصل ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں جو نثر لکھی گئی وہ بعض سیاسی مصلحتوں کے اثر سے وجود میں آئی اور کوئی باقاعدہ تحریک نہ بن سکی۔ اگرچہ میر امن کی باغ و بہار اُردو نثر کا شاہکار ہے لیکن اس نے اپنے دور کو متاثر نہیں کیا۔

ادبی حیثیت سے سرسید سے قبل اگر کوئی نثر قابل وقعت اور لائق پیروی ہے تو مرزا کی نثر ہے جس میں شاہراہ عام سے ہٹ کر ایک نیا انداز تحریر اختیار کیا گیا۔ اور نثر کے حقیقی مقصد وضاحت اور صراحت کو پہلی مرتبہ کام میں لایا گیا۔ گویا نثر کی حقیقی خوبی، سادگی اور صفائی جو اب تک تکلف اور تصنع مذاق کی وجہ سے دبی ہوئی تھی ان خطوط کی بدولت ابھر آئی اور اپنے مافی الضمیر کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک نیا سلسلہ پیدا ہوا جو اُردو ادب میں ایک نیا طریقہ تھا۔ اکرام نے ٹھیک لکھا ہے کہ "غالب نے دہلی کی زبان کو تحریری جامہ پہنایا اور اس میں اپنی ظرافت اور مؤثر طرز بیان سے وہ گلکاریاں کیں کہ اردوئے معلی اخاص و عام کو پسند آئی اور اُردو نثر کے لیئے ایک طرز تحریر قائم ہو گیا جس کی پیروی دوسروں کے لیئے لازم تھی۔

غالب کی نثر کی پیروی سرسید اور حالی کے حصے میں آئی، جنھوں اسے مختلف و متنوع مضامین میں استعمال کر کے بہت آگے بڑھا دیا اور جدید نثر کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر رنگ کو ادا کرنے پر قادر ہو گئی۔ یہ قدرت بیان اُسے ورثے میں غالب سے ملی۔ مرزا کے خطوط پر نظر ڈالیے تو اس میں ایک رنگا رنگی ملتی ہے جس میں زندگی کے ہر جذبے کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

سرور انبساط، رنج و الم، سختی و سستی، تعریف و توصیف، طنز و تشنیع، نفرت اور اُلفت اور اس لحاظ سے عبارت کا انداز۔ مثلاً مرزا نے حکیم تفضل حسین سے اپنا دیوان منگایا تھا انھوں نے اس کے بھیجنے میں کچھ پس و پیش کیا۔ اُس پر مرزا نے اُن کو سختی سے لکھا "کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی اُستادی سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار یا پانچ سو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خریدا ہوا دس روپے کی۔ سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ تم مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اسکو دیکھ لوں۔ پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں۔ یا مجھ کو ستانا اور آزار دینا یہ دل منظور ہے۔ وہ کتاب میرے آدمی کو ابھی دیدو۔ باللہ و اللہ اس میں سے جو میرے پاس

نہیں ہے نقل کرکے تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور اگر میری قسم کو نہ مانو اور کتاب بحامل رقعۂ ہذا کو نہ دو تو تم پیا آفریں!"

یہ تحریر مرزا کے جلال کا نمونہ ہے۔ جس میں تلخی اور ناگواری کے جذبات موجزن ہیں۔ ہر لفظ مکتوب الیہ کے لئے "تازیانہ" مگر اس تلخی میں حسن اور اس گرمی میں شوخی اور بانکپن موجود ہے اور ہر جملہ سے بے تکلفی ٹپکی پڑتی ہے۔ دراصل مرزا کی نثر کی یہی برجستگی موزونیت اور شوخی ہے۔ بقول حالی جس نے اُن کے مکاتیب کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ اگرچہ مرزا کے بعد آج سیاسی، مذہبی، علمی اور اخلاقی سبھی طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور برابر لکھی جا رہی ہیں۔ زبان کا دائرہ برابر وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس کا دامن بیش بہا جواہر سے پُر ہوتا جا رہا ہے مگر جو طرزِ خاص اور دلچسپی مرزا کے بیان میں نظر آتی ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے اور لطفِ بیان کے اعتبار سے تو وہ بالکل منفرد ہیں۔)

نظیر اکبر آبادی

نظیر اکبر آبادی

نظیر نے وہ زمانہ پایا جب تمام ہندوستان میں بدنظمی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری اور صوبہ داروں کی سرکشی و خودمختاری نے تمام سیاسی و معاشی انتظام کو متزلزل کر دیا تھا۔ انتشار اور افتراق کے اس ماحول میں کسی کو سکون نصیب نہ تھا، ہر طرف خوف و دہشت اور اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ نظیر کی زندگی بھی اسی بے چینی میں بسر ہوئی، یہ بے کیفی اور افسردگی نظیر کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ نظیر طبعاً خوش طبع اور باغ و بہار طبیعت کے آدمی تھے اور ان کا تعلق طبقہ عوام سے زیادہ تھا اس لئے ان کے کلام میں میناکاری اور مرصع سازی کے بجائے موضوعات کی رنگارنگی زیادہ ہے انھوں نے زندگی کو جس طرح دیکھا اسی طرح شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔ نظیر کے کلام میں اگرچہ پوری زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے تاہم ان کے یہاں بعض مخصوص رجحانات پائے جاتے ہیں۔ کلام کا ایک حصہ فنا اور بے ثباتی دنیا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ زندگی اور

اس کی کشمکش کی تفصیلات کو پیش کرتا ہے۔ قلندری اور انسان دوستی کا مظہر ہے۔ آگرہ اور اس کے گرد و نواح کی زندگی سے متعلق ہے۔ مروجہ اقدار اور اُن کے خلاف ردِ عمل کا آئینہ دار ہے۔ مگر اُن کے کلام کا وہ حصہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے جو زمانہ کی بے چینی۔ اضطراب غلط پُرفریب سیاست اور دکھوکھلی معاشرت پر صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔

نظیر کے یہاں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کے نقشے جو بظاہر صوفیانہ مزاج کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں دراصل اس احساس او بےچینی کے ترجمان ہیں جو تہذیبوں کے مٹنے غلط کاریوں کو پروان چڑھانے اور بے اصولیوں کو اصول بننے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ بنجارہ نامہ صرف فنا و زوال کا مرقع نہیں بلکہ لٹیروں، ڈاکوؤں اور ظالموں کے لیے تنبیہہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

آدمی نامہ، مفلسی نامہ بھی ایک دُکھے دل کی پکار ہیں جیسے زندگی اور کائنات کے ذخیروں سے سوائے محرومی اور ناکامی کے کچھ نہ ملا ہو، فقیروں کی صدائیں یہ آواز اور زیادہ دردناک ہو جاتی ہے سودا اور میر کے شہر آشوب بھی اسی صدائے دلِ خراش کے ترجمان ہیں لیکن نظیر کی آواز میں دردِ خستگی زیادہ ہے۔ اس کا دائرہ اثر بھی زیادہ وسیع ہے اسے خاص و عام سبھی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ اسپ بہت کودا اُچھلا اب کوڑا مار و زیر کرو
جب مال اکھٹا کرتے تھے اب تن کا اپنے ڈھیر کرو
گڑھ ٹوٹا لشکر بھاگ چکا اب میان میں تم شمشیر کرو
تم صاف لڑائی ہار چکے اب بھاگنے میں مت دیر کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت کا نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ آئے دن لوگ یہ منظر دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی فنا اور بربادی کے تصورات ذہنِ انسانی سے کیوں فراموش ہو جاتے ہیں۔ لوگ حقائق کو بھول کر خود غرضیوں، مکاریوں اور سازشوں میں ایسے اُلجھ گئے ہیں کہ اُن کو حرص و ہوس کے سوا کسی اور چیز کا خیال نہیں رہتا۔ تمام پریشانیوں اور خلفشار کا سبب انسان کی یہی سرکشی اور باغیانہ ذہنیت ہے۔ نظیر ایسے لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کے ٹھاٹھ کئے دن کے ہیں اور وہ بھی ظلم و جبر سے حاصل کئے ہوئے۔ فنا تو خیر بعد کی منزل ہے اس سے قبل بڑھاپے کا زمانہ آتا ہے جب "تن سوکھ جاتا ہے، پیٹھ کبڑی ہو جاتی ہے اور آنکھیں چندھیا جاتی ہیں"،

مختار نہ مجبور نہ خود کام رہے گا   آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری محض اس لئے نہیں ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے بلکہ دنیا برتنے کے لئے ہے۔ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق گزر اوقات کے وسائل تلاش کرے اور موقع کو غنیمت جانے

نہ کہ ہوس پرستیوں کو ہوا دے بلکہ ہر دم تغیر کے فلسفہ پر نظر رکھے۔
زندگی کا یہ ارتقا عروج و زوال بلندی اور پستی سے عبارت ہے نظیر جب زندگی کی کامرانیوں کی طرف بلاتے ہیں تو اُن کے پیش نظر یہ صورت حال ہوتی ہے۔

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں | یہ بہار عیش یہ شور جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب شراب ارغوانی پھر کہاں | عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں

شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

نظیر کا ایک طرف دنیا کی بے ثباتی سے ڈرانا اور دوسری طرف عیش خوباں کی طرف متوجہ کرنا بظاہر بے ربط معلوم ہوتا ہے بے شک دنیا کی آخری منزل فنا ہے۔ لیکن زندگی اپنے مقصد کے ساتھ آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا نام ہے۔ اگر یہاں کے ہنگامے دلفریب ہیں تو یہاں کا انجام بھی عبرت ناک ہے۔ یاس و اُمید حسرت و ناکامی کے درمیان جو زندگی گذرتی ہے وہی اصل زندگی ہے، یہ دنیا ایک دوسرے کو سمجھنے برتنے اور ساتھ دینے کی جگہ ہے۔ زندگی کا یہ متوازن اور معتدل نظریہ نظیر کے یہاں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے:۔

تو اور کی تعریف کر، تجھ کو بھی ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے

تو اور کو مہمان کر، تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے، پانی پلا پانی ملے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا الفقد ہے اِس ہاٹ دے اس ہاتھ لے

جہاں جب تلک یاں سینکڑوں شادی و غم ہوں گے
ہزاروں عاشق جانباز اور لاکھوں صنم ہوں گے
کنارو بوس اور عیش و طرب بھی دمبدم ہوں گے
مگر جتنے یہ اپنی صعت کے ہیں یہ سب عدم ہوں گے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اُردو شاعری میں زندگی کے عملی پہلو پر نظیر نے سب سے پہلے غور کیا سودا اور میر کے شہر آشوب مغلوں کے ابتری نظام پر زبردست طنز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیکاری۔ بے روزگاری اور افراتفری کا نوحہ ان شعراء نے بھی پڑھا ہے، لیکن ان کی توجہ زیادہ تر ایک مخصوص طبقہ اور سماج تک رہی، نظیر کے یہاں سودا کا سا طنز تو نہیں لیکن اُن کے شہر آشوب آگرہ کی عام بے کاری پریشان حالی اور بے بسی کا عبرت انگیز مرقع ہیں۔ یہ اُن بے کسوں کی فریاد ہے جو اس ہنگامۂ محشر میں بلک بلک کر اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ گویا عام انسانی جذبات کی ترجمانی ہے۔ نظیر کو یہی خصوصیت ان شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ جنھوں نے اپنے دور کی ترجمانی تو کی لیکن ایک مخصوص

دائرہ سے آگے نہیں بڑھے۔ نظیر نے نہ تو واقعات پر پردہ ڈالا ہے اور نہ انھیں استعاروں اور کنایوں میں بیان کرکے محدود کر دیا ہے بلکہ صاف اور سیدھا راستہ اختیار کیا ہے۔ میر نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

بے زری کا نہ کر گلہ غافل ۔۔۔ رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہاں میں گذرے ۔۔۔ وقت رحلت کے کس کنے زر تھا

یا ایک اور جگہ اس طرح نوحہ زاری کی ہے:

لوٹی لگ لگ کے جھڑتی ہے مائی ۔۔۔ آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
اب وہی گھر ہے بے سروسایہ ۔۔۔ اور میں ہوں وہی فرومایہ

نظیر بھی مصیبتوں اور خانہ بربادیوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ افلاس کے ہر پہلو کو لیتے ہیں۔ زر کی طلب سب کو ہوتی ہے۔ مفلسی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ لیکن جب یہ طلب اپنی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر اس کی چاٹ کیا کیا گل کھلاتی ہے

دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر
جتنے ہیں سب کے دل میں بھری ہے ہوائے زر
آنکھوں میں دل میں جان میں سینے میں جائے زر
ہم کو بھی کچھ تلاش نہیں اب سوائے زر
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

اب جن کے گھر میں ڈھیر ہے سونے کے دام کے
ہر اک امیدوار ہیں اُن کے غلام کے
سب ہل کے پاؤں چومے ہیں اُس کے قلام کے
کیا رتبے ہیں طلائے علیہ السلام کے

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

لیکن جس کے پاس یہ زر نہیں ہوتا اس پر کیا گزرتی ہے۔ بقول نظیر

ع۔ بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی

یہ دُکھ وہی جانتا ہے جس پہ مفلسی آتی ہے، نظیر نے میر کی طرح توکل اور قناعت کا سبق دیا ہے۔ لیکن دونوں کے نقطہ نظر میں بہت فرق ہے۔ میر کے یہاں توکل اور قناعت کا جو تصور ہے ہر ایک کے لئے قابل عمل نہیں ہے۔ زندگی مسلسل اضطراب میں بسر نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک اس بار کو نہیں اٹھا سکتا اور نہ محض مقدر پہ قانع رہ سکتا ہے۔ نظیر نے اس کے اخلاقی اور سیاسی بلکہ معاشی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ نظیر کا نظریہ ایک طرف حرص و آز سے محفوظ رکھنے پر زور دیتا ہے تو دوسری طرف سکونِ قلب کا بھی سامان بہم پہنچاتا ہے اور ایک مطمئن زندگی بسر کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ جب حالات ناسازگار ہوں، دنیا چھوٹے بڑے بندہ و آقا میں تقسیم ہو تو پھر تونگروں کی ہمسری کرنے سے سوائے

جی کے زیاں کے اور کچھ حاصل نہیں اس تکلف میں تکلیف سراسر ہے
میر کے توکل میں صبر و قناعت کی تلقین اس لئے کی جاتی ہے کہ قسمت
میں یہی لکھا تھا۔ نظیر اس عدم مساوات کو انسانوں کی ہوس کاریوں
کا مظہر سمجھتے ہیں۔ میر کے اس تصور سے انفعالیت پیدا ہوتی
ہے، نظیر کے کلام سے عدم مساوات اور طبقاتی زندگی کے خلاف
بیزاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری اُن کے کلام کو ایک طرح کا معاشرتی
'عہد نامہ' کہتے ہیں۔ یعنی زندہ رہنے دو اور زندہ رہو۔ نظیر بتاتے
ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو زندہ نہیں رہنے دیتے وہ انسان کہلانے
کے مستحق نہیں۔ آدمی نامہ، مفلسی، لدوئی، کوڑی، پیسہ، روپیہ،
زر، آٹا، دال کا بھاؤ اور برسات کی بہاریں، جیسی نظموں میں
انھیں خیالات کی تفسیر پیش کی گئی ہے۔ دنیا کے سلسلۂ نظام میں
ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے اور اس سے انسان کے اخلاق پفس
اور ذہن پر کیا اثرات پڑتے ہیں، اور انسان مجبور ہو کر کن غلطیوں
کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھائی بند، عزیز و اقارب اس وقت تک ساتھ
دیتے ہیں جب تک انسان اپنی روزی پر قادر ہے ؎

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے

اردو میں برسات پر نظمیں جو ملتی ہیں ان میں ایک تاثراتی کیفیت پائی

جاتی ہے جس کا سب سے خوش آئند پہلو اس کی منظر نگاری ہے، لیکن نظیر نے اس کے المناک پہلو پر بھی توجہ دی ہے بلکہ ان کے یہاں یہ نقش بہت زیادہ گہرا ہے۔ یہی نقوش ان کی انسان دوستی اور بنی نوع انسان کی بہبودی کے مظہر ہیں جسے موجودہ دور میں جمہوریت پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ نظم کا اختتام مایوس کن نہیں لیکن غربت اور مفلسی کی دردناک آواز سب آوازوں پر چھا جاتی ہے۔ برسات اپنی بہاروں کے ساتھ جن پریشانیوں کو لاتی ہے نظیر کو اس کا احساس سب سے زیادہ ہے اور یہی احساس غریبوں کی فریاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

کتنوں نے اپنے غم سے اب ہے یہ گت بنائی
میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی
پھوٹا پڑا ہے چولھا لوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

انسانی فطرت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں لیکن ماحول کے اختلاف سے ان کی زندگی کے دھارے مختلف سمتوں میں بہتے ہیں۔ زندگی خواص اور عوام میں بٹ جاتی ہے اور اسی اعتبار سے ہر چیز کی قدر و قیمت لگائی جاتی ہے اور بہت سی خوبیاں اور نیکیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ نظیر نے نظم مفلسی

میں اس عقدہ کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے۔

مفلس کرے جو اُن کے مجلس کے بیچ حال
سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اُسنے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اسے سنبھال
مفلسی میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آکے ملاتی ہے مفلسی

نظیر نے مفلسی کی جن لعنتوں کا ذکر کیا ہے اس کی بنیاد حقائق پر ہے۔ اور اپنے زمانہ کی سماجی ابتری کا مرقع ہے۔ لوگ پریشان حال ہیں۔ وہ ان پریشانیوں سے نکلنا بھی چاہتے ہیں لیکن اُن کے بیچ میں توہمات کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں جو اُن کا راستہ روکتے رہتے ہیں۔ اور خود انھیں اپنی زنجیروں سے محبت کرنے پر مجبور کرتے ہیں کیونکہ ان کا ماحول انھیں یہ سکھاتا ہے وہ ان تکالیف کا تھوڑا بہت احساس بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں احساس کی وہ شدت نہیں جس سے یہ چنگاری شعلہ بن جائے۔ نظیر کی نظموں کو پڑھئے تو انسانوں کے درمیان پست وبلند کے جو مصنوعی معیار قائم کئے گئے ہیں اُن کا احساس ہوتا ہے اور انھیں بدلنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم دن رات انھیں حالات میں زندگی گزارتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ ذہنوں کو متاثر کرے اور اپنے کلام کی تاثیر سے دلوں کو

تڑپا دے۔

اردو شاعری کی دنیا میں یہ آواز اپنے وقت کی آواز سے بالکل مختلف ہے۔ چونکہ یہ عوام سے زیادہ متعلق ہے اس لئے انھیں میں زیادہ مقبول ہے۔ یہی عوام ان نظموں کو شہر بہ شہر بطور سوغات لے جاتے ہوں گے۔ اور انھیں میں ان کے چرچے ہوتے ہوں گے لیکن اپنی مخصوص دل کشی کے سبب یہ آواز خواص کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی رہو گی۔ شیفتہ کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ نظیر کے اشعار سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں۔ شیفتہ اپنے عہد کی تہذیب کے نمائندہ تھے اس لئے وہ اس خاص سطح سے نیچے نہیں آ سکتے تھے۔ نظیر اپنی سطح کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ شیفتہ بازاری رنگ، عامیانہ زبان اور سوقیانہ جذبات کو کیسے گوارا کر لیتے نظیر کا سرمایہ حیات یہی لوگ تھے وہ انھیں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے اپنے گرد و پیش سے آنکھیں کس طرح بند کر لیتے اور بقول نظیر

ع۔ وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں

دربار شاہی تک کیسے پہنچ سکتے تھے۔ وہ زندگی کو بلندی سے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو اسے قریب سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اسی سبب سے زندگی کا عملی پہلو اُن کے پیش نظر زیادہ رہتا تھا عبدالغفور شہباز نے لکھا ہے کہ نظیر نے کوئی صرفی و نحوی مسئلہ بیان نہیں کیا ہے۔ اُن کے یہاں فلسفیانہ رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ صحیح ہے کہ نظیر نے کسی مخصوص فلسفہ کو بیان نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے جن حقائق کی ترجمانی کی ہے وہی زندگی کے سب سے اہم مسائل ہیں۔ نظیر کی اسی حقیقت پسندی کو پرانے سخن فہموں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر شخص اپنی تعریف سن کر خوشی کا اظہار کرتا ہے ہر چند کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ جذبہ ناپسندیدہ ہے تاہم خوشامد اور خودپرستی سے کوئی بھی بیزار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جذبہ اپنے ظاہر اور باطن کے لحاظ سے ایک ہے۔ نظیر کے پیش نظر یہی پہلو ہے۔

مرد و زن طفل و جواں خرد و کلاں پیر و فقیر
جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر
تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

نظیر کے یہاں موضوعات کی جو رنگا رنگی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے تمدن، تصوف، مذہب، معاشرت، وطن، طفلی جوانی بڑھاپا۔ عیش، مفلسی، فنا، بقا، قناعت، تسلیم و رضا، پیسہ کوڑی آٹا دال، سردی، گرمی، برسات، ہولی دیوالی، عید بقر عید، کھیل تماشے، رسم و رواج، چرند پرند، عمارات، حسن و عشق اور اس کے ناز و انداز

سبھی پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور کتاب زندگی کے ہر ورق کو پڑھا ہے اور اس سے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے اُن کا کمال یہی ہے کہ "جب اس دور میں فطرت پرستوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی نظیر نے فطرت کی طرف توجہ دی"

ان رسموں اور تہواروں کا معیار اور مقصد کیا تھا شرفار اور امرار انھیں کس نظر سے دیکھتے تھے۔ نظیر کو اس سے بحث نہ تھی، نظیر کو یہ چیزیں محبوب تھیں۔ انھیں اُن کی مذہبی حیثیت سے بھی کوئی سروکار نہ تھا وہ تو ان رسموں اور اجتماعات کو میل ملاپ کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ان کی سماجی حیثیت پر نظر رکھتے تھے۔ نظیر نے ان رسموں کی تفصیلات بیان کی ہیں اُن سے عقیدت اور محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن اس محبت کی بنیاد مذہبی عقیدہ پر نہیں بلکہ انسان دوستی پر ہے جس طرح شب برات اور عید کے آنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح ہولی دیوالی اور جنم کنھیا کے موقع پر بھی خوش نظر آتے ہیں۔ وہ حمد و منقبت کو بھی عقیدت سے پڑھتے ہیں اور کرشن کنھیا اور بھیروں سے بھی اظہار عقیدت کرتے ہیں۔

نظیر نے شب برات کے مذہبی اور سماجی دونوں پہلوؤں کو عام روایت کے مطابق پیش کیا ہے۔ انھوں نے نہ تو کسی بدعت کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے شرعی پہلو سے بحث کی ہے بلکہ مسلمانوں

ہیں جو عام تصور ہے اس کو پیش نظر رکھا ہے۔ عام لوگوں کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ اس روز اپنے بندوں کو رزق تقسیم کرتا ہے اور موت کا وقت معین کرتا ہے نظیر اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔

کوئی دوستوں کو دل میں سمجھتا ہے اپنے غیر
کوئی دشمنوں سے دل کا نکالے ہے اپنے بیر
کہتا ہے واں نظیر بھی آتش کی دیکھ سیر
یارب تو سب کی کیجیو برسا برس کی خیر
بے طرح کر رہی ہے نموداری شب برات

ہولی، دیوالی ہندوؤں کے اہم تہوار ہیں۔ ہولی کی رنگ رلیاں اور دوالی کے چراغاں مشہور ہیں۔ ان تہواروں کا عام لوگوں کے نزدیک یہی مقصد ہے۔ دیوالی میں قمار بازی بڑے زوروں پر نظر آتی ہے اور پھر ہندو بطور شگون کے کچھ نہ کچھ ہارتے جیتتے ہیں اور بہت سے تو اس میں ایسے مست ہوتے ہیں کہ سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں جو ذرا محتاط ہیں وہ دو ایک بازی کھیل کر گھر کی راہ لیتے ہیں۔ لیکن اس کا شگون ضرور کرتے ہیں۔

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانو یارو
نصیحتیں ہیں انھیں دل میں ٹھانو یارو

جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو
جو جواری ہو نہ برا اُس کا مانیو یارو
نظیرؔ آپ بھی ہے جوار یا دوالی کا

اس شغل میں ہندو مسلم کی قید نہیں خود میاں نظیرؔ بھی اس شگون میں شریک ہیں خواہ رسمی طور پر ہی سہی، نظیرؔ کے یہاں یہی وسعت قلب اور رنگ و نسل سے بے نیازی انھیں ایک عہد آفریں شاعر بنا دیتی ہے۔ وہ زندگی کی ہر منزل پر عام انسانوں کے ساتھ ہیں۔ اُن کا اپنا عقیدہ انھیں دوسروں کے عقائد کے احترام سے نہیں روکتا۔ ہندو خاص خاص موقعوں پر اپنے دیوی دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں اور اس طرح اپنے دل کو سکون دیتے ہیں۔ نظیرؔ بھی اس عبادت میں اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ زندگی اپنی وسعت کے ساتھ ایک وحدت ہے۔ وہ ایک طرف شیخ سلیم چشتی سے اظہار عقیدت کرتے ہیں تو دوسری طرف بھیروں کے بھکاری بن کر چنتا مٹانے کی التجا کرتے ہیں۔

غرض نظیرؔ نے زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے بے شمار موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ آگے چل کر انجمن پنجاب نے ان موضوعات کی طرف باقاعدہ توجہ دی۔ آج بیسویں صدی میں حیات و کائنات کے مسائل شاعری کا موضوع بن گئے ہیں اور برابر وسعت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس وسعت میں نظیرؔ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہی اُن کی عظمت ہے۔

حالی کی شخصیت

کہا جاتا ہے کہ انسان کو سیاسی سوجھ بوجھ، منصف مزاجی، ذوقِ عمل اور شعر و ادب سے دلچسپی کچھ تو والدین سے وراثت میں ملتی ہے اور کچھ ماحول اس پر اثر انداز ہوتا ہے جہاں تک حالی کے آبا و اجداد کا تعلق ہے اُن کے ذہنی رجحان کا صحیح علم نہیں البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ کئی پُشت قبل اُن کے اجدا منصب قضا پر فائز تھے لیکن اُن کے باپ بہت معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور محکمہ نمک میں معمولی حیثیت کے ملازم تھے۔ نہ صاحب علم و فضل تھے نہ صاحب ثروت، اس لئے حالی کو وراثت میں کس حد تک کیا ملا ہمارے علم سے باہر ہے البتہ اُن کی صلاحیت نے انھیں ہندوستان کا ایک مشہور مصنف اور شاعر بنا دیا انھوں نے ایک معمولی حیثیت سے زندگی شروع کی اور ملازمت میں آخر تک معمولی حیثیت سے آگے نہیں بڑھے لیکن ان کی زندگی اور ذکاوت نے اپنے عہد کو جس طرح سمجھا اور سمجھ کر جس طرح سمجھایا وہ انھیں کا حصہ ہے یہاں تک کہ آج ہم حالی کو جدید ادب کا بانی اور جدید ذہنی زندگی کا معمار سمجھتے ہیں۔

حالی نے قدیم مشرقی ماحول میں آنکھ کھولی اسی ماحول میں تعلیم پائی، اگرچہ وہ ادھوری تاہم مشرقی فضا ہی میں انھوں نے سانس لی اس لئے مشرقی افدار اور طرز زندگی انھیں بہت عزیز تھا مگر مشرق سے یہ محبت اور قدیم اخلاق و معاشرت سے وابستگی انھیں محض اس دائرہ تک محدود نہ رکھ سکی بلکہ انھوں نے روح عصر کو جذب کر کے اپنے دور کے تقاضوں کو سمجھا اور پورا کیا اور ذاتی جذبات و خواہشات پر وقت کی ضرورت کو ترجیح دی۔ سرسید کے اصلاحی خیالات کی تبلیغ اس لئے نہیں کی کہ اس میں کوئی ذاتی منفعت کو دخل تھا بلکہ ملک اور قوم کے لئے مفید سمجھ کر لیکن انھیں عام طور پر سرسید کی صدائے بازگشت کہا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ سرسید کی تقلید نے حالی کی انفرادیت کو مجروح کیا اور وہ بعض باتیں ایسی کہہ گئے جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مستقبل کے متعلق کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے ٹھیک لکھا ہے کہ "حالی کی طبیعت بالقوہ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی" وہ قومی مسائل سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ اُن کی غم خوار طبیعت وقت کی ضرورتوں پر زیادہ متوجہ رہی۔ مولانا ذہنی اُلجھنوں اور خود پرستی میں نہیں اُلجھے۔ اُن کے پیش نظر صرف خدمت، علم اور خدمت قوم کا جذبہ کارفرما رہا جسکی وجہ سے اُن کی زندگی میں یکسانیت ملتی ہے تنوع نہیں وہ ایک دردمند دل لیکر پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے ذاتی شہرت اور شخصی اعزاز کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ قومی دلسوزی خلوص احلم تواز ہی اور بردباری نے انھیں ان الجھنوں میں پھنسنے نہ دیا۔ جن میں اُلجھ کر انسان

اپنی صلاحیتوں کے ایک بڑے حصّہ کو ضائع کر دیتا ہے۔

انیسویں صدی تک مسلمانوں میں انفرادی طور پر بہت سی ایسی خوبیاں پائی جاتی تھیں جن سے آج کی نسل محروم ہے۔ حالی میں بھی اسلاف کی تمام خوبیاں وضعداری، شرافت، خاکساری، شرم و حیا، خلوص، ایثار اور صبر و شکر کی صفات موجود تھیں اور اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ غالباً اسی اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر سید محمود جیسے تند مزاج شخص نے کہا تھا اگر خداوند مجھے بندوں میں کسی کی پرستش کرنے کے لئے کہتا تو میں بلا شبہ حالی کی پرستش کرتا۔ بلاشبہ حالی کی انسانیت عروج پر تھی اور بحیثیت انسان کے سر سید کے گروہ میں اُن کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ دراصل حالی کے نزدیک خدمتِ خلق انسان کا فرضِ اولین ہے۔ انسانیت نام ہے بے غرضی اور بے لوثی سے نیکی کی جستجو کرتے رہنا اور نئی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہنا، مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرنا۔ بقول رشید احمد صدیقی "حالی مسلمان نہ بھی ہوتے تو بھی وہ مسلمانوں کی فلاکت و ہلاکت پر انسانی ہمدردی اور اس قوت ایمانی کے ساتھ آنسو روتے اور ان کی مسکنت پر ان تمام طوفان زائیوں پر فوق تھی جن سے ان کو ساتھ تھا پیغمبر اور فاتح میں یہی فرق ہے۔"

حالی نے مذہبی مسائل پر کم لکھا ہے کسی دینی پیشوا کی مکمل

لائف لکھنے کا بھی انھیں شرف حاصل نہیں لیکن انھیں مذہب سے گہرا شغف تھا۔ یادگار غالب اور ان کے خطوط میں اس کی بعض مثالیں ملتی ہیں لیکن جب جوش و خروش کی ندی چڑھ کر اتری اور طبیعت اعتدال پر آئی تو یہ شدت بھی کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ مذہبی نقطہ نظر میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی گئی لیکن مذہب ہمیشہ اُن کی زندگی کا اہم جزو رہا۔ اُن کے یہاں مذہب کا تصور فطرت سے ہم آہنگ ہے جو مادی وسائل مہیا کرنے کا منکر نہیں موئد ہے۔ وہ انگریزی حکومت سے دوستی کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور مغربی علوم و فنون کے مداح تھے۔ اگرچہ اس میں سرسید کے اثرات کو کافی دخل ہے تاہم حالی نے اس رنگ کو پوری طرح سوچ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ سرسید تحریک کی بڑی تبلیغ کی لیکن بہت سے سیاسی سماجی مذہبی اور تعلیمی مسائل میں اُن سے اختلاف کیا۔ لیکن اختلاف کو ذاتیات سے الگ رکھا حالی کی انفرادیت اس میں ہے کہ انھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کیا۔ کیا یہ انفرادیت کم ہے کہ ذاتی تشخص سے کام نہیں لیا لیکن ایک قوم کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور اسے ماضی پرستی کے چکر سے بہت کچھ نکالا اور ضبط و نظم، توازن اور اعتدال کو اپنے اثر سے ایک فن بنا دیا۔

ایک سیدھی سادی زندگی کا یہ اصول ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ الجھنوں اور پیچیدگیوں سے گریز کرتی ہے۔ ایڈیسن کے سوانح نگار نے اس کی نسبت

لکھا ہے کہ " اس کی زندگی میں کوئی ڈرامائی واقعہ نہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس میں ذہانت اور جوش کی کمی تھی جو دنیا والوں پر اثر ڈالنے کے لئے ضروری ہے۔ وہ دراصل ایک شرمیلا سنجیدہ انسان تھا مگر اس کے باوجود اس کے ممتاز معاصرین نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے انسان میں قابل تقلید خصائل کی کمی نہیں ہو سکتی۔ حالی کی بھی یہی کیفیت تھی وہ سنجیدہ، خاموش اور شرمیلے انسان تھے مگر ان کی انفرادیت نے ان راستوں کو اختیار کیا جو اس سے پہلے کسی کے قدم سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اس راہ میں مشکلات تھیں مخالفتیں تھیں اور ہر طرح کی رکاوٹیں مگر ایک شریف انسان نے ان ناہمواریوں کو جس طرح ہموار کیا وہی اس کی انفرادیت ہے جو خاموشی کے باوجود بڑی مؤثر اور دائمی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین ان کی نسبت لکھا ہے:-

" مولانا (حالی) یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان تھے اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے "

اور ڈاکٹر عابد حسین کے الفاظ میں:-

" بغض وحسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں۔ حلم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے .... وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں محبت اور خدمت " قاضی عبدالغفار

نے حکیم اجمل خاں کے لئے اناطول فرانس کے لئے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"دل میں احساس فرائض کا جوش اور سطح پر ایک سکون مطلق"

یہ بات حالی پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔

حالی کا تنقیدی شعور

حالی اُردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ اِن سے قبل اُردو میں جو تنقیدی سرمایہ ہے اُس میں تنقید کا باقاعدہ شعور نہیں اور نہ اُس میں کوئی مستقل نظریہ ادب یا تخلیلی ذہن ملتا ہے۔ خود حالی کے یہاں مقدمہ شعروشاعری سے قبل کچھ متفرق اشعار یا منتشر خیالات ملتے ہیں مجموعہ نظم حالی کے دیباچہ میں اِس شعور کی ابتدائی صورت نظر آتی ہے۔ یہ نقوش زیادہ واضح اور گہرے نہیں ہیں لیکن پھر بھی ایک نئی تنقیدی شعور کی ابتدا کے مظہر ضرور ہیں۔ اور جدید رجحانات کے اثر و نفوذ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

" اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ جو لوگ ہندوستان میں اُردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے، وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغہ کو شعر کی ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ یہ واقعہ نگاری

اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔"

حالی کے ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ شیفتہ کی صحبت اور اپنی افتادِ طبع کی بنا پر انھیں مبالغہ سے نفرت تھی اس بیزاری کے اسباب دراصل اس سیاسی و معاشی انقلاب میں زیادہ پوشیدہ ہیں، جو انگریزوں کے تسلط اور مسلمانوں کی غلامی کی وجہ سے وجود میں آیا تھا۔ حالی کا اصلاحی ذہن جو قومی ہمدردی اور غم گساری سے سرشار تھا۔ کسی راستے کا متلاشی تھا اور اُن کی روح کسی ذہنی انقلاب کے لئے بے چین تھی، جس کا اظہار اُن کی جدید شاعری میں ہوا لیکن اُن کی غزلوں میں بھی جو احساس ملتا ہے وہ قدیم رنگ تغزل سے الگ ہے۔

قلق اور دل میں سوا ہو گیا | دلاسا تمھارا بَلا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا | وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
نہیں بھولتا اُسکی رخصت کا وقت | وہ رو رو کے مِلنا بَلا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال | کہیں سادہ دِل مُبتلا ہو گیا

اُردو غزل کی روایت کے حالی وارث بھی ہیں اور باغی بھی، زندگی کی کشمکش اور بڑھتی ہوئی سیاسی و اقتصادی بے چینی اس روایت کو متزلزل کرتی ہے اور انتشار و افتراق کا سیلاب اِن کو بہالے جاتا ہے۔ مایوسی اور بے چینی کی فضا انھیں مغموم بناتی ہے۔ حالی کے علاوہ اس دور کے بہت سے شعراء میں یہ احساس غیر شعوری

طور پر جھلکتا ہے لیکن اس کے اسباب اور اثرات کا سراغ حالی کے یہاں ملتا ہے ۔ غزل میں ان کا لب و لہجہ میر و مصحفی کی پیروی کے باوجود بدلا ہوا نظر آتا ہے ۔ حالات اور گرد و پیش سے اور زیادہ بدل جاتا ہے اور عشق کی کسک محسوس کرتے ہوئے بھی وہ سپردگی کی منزل میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرتے اور منزل عشق کی سرحد تک پہنچ کر واپس ہو جاتے ہیں ۔ اور طرح طرح سے اپنی تسکین کرتے ہیں ۔

کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں　　سرسری دل کی واردات نہیں

حالی جب یہاں ہمت ہار بیٹھتے ہیں تو ان کے ذہن کا رخ دوسری طرف ہو جاتا ہے

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا ÷ یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی ÷ تمھیں جلد ترخاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کا ÷ بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑیگا
ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی ÷ مگر اب میری جان ہونا پڑے گا

کر دیا چپ واقعات دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
دل پر درد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ان غزلوں میں ایک طرح کی اندرونی کشمکش بھی نمایاں ہے یہ کشمکش حالی کے اخلاقی نظریات ذہنی، افتادِ طبع اور فطری تقاضوں کے درمیان ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنجش و التفات اور نازو نیاز کے نشیب و فراز سے گھبرا گئے ہیں۔ پارسائی اور رسوائی میں ایک کشمکش جاری ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور زیادہ پریشان کر رہے ہیں۔

حالی نے ۵۷ء کی مصیبت اور بربادی کے جو مناظر دیکھے تھے ان کا اثر، ان کی قدیم و جدید غزلیات میں کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے۔ ان اثرات نے رفتہ رفتہ دِل سوز کیفیت اختیار کر لی۔ قدیم و جدید کے تصادم نے زندگی کے بہت سے نئے پہلو واضح کر دیئے لیکن قدیم ڈگر کو چھوڑنا آسان نہیں تھا۔ ایک مدت تک حالی اسی شاہراہ پر چلتے رہے لیکن ایک خلش برابر کام کرتی رہی اور طبیعت رفتہ رفتہ جدید راہ سے مانوس ہوتی گئی اور خود اُن کے الفاظ میں "زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پُرانی شاعری سے دِل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی! نہ یاروں کے اُبھارے سے دِل بڑھتا تھا اور نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا مگر یہ ایک ایسے ناسور کا منھ بند کرتا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے بخارات اندرونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا۔ وہ دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی

رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔"

مسدس میں یہ لہجہ خاصا تلخ ہو جاتا ہے، لیکن تنقیدی نقطہ نظر سے ابھی تک حالی کا نظریہ شعر و ادب مزید وضاحت کا محتاج رہتا ہے۔ مسدس میں مسلمانوں کی عروج و زوال کی کہانی میں ایک غم انگیز کیفیت چھائی ہوئی ہے، اسی طرح شعراء و علماء کی جو کیفیت پیش کی گئی ہے وہ ایک دُکھے دل کی پکار ضرور ہے لیکن اس سے کسی نظریہ کے قائم کرنے میں زیادہ مدد نہیں ملتی۔ فکر و فن کا یہ رجحان مرثیہ حکیم محمود خاں میں واضح شکل اختیار کرتا ہے۔

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلہ پاتے تھے لوگ
پڑگئی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جاکر نہ سم
کوئی یہاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا!

وقت کی یہی راگنی حالی کے نظریہ شعر و ادب کی اساس بن گئی سرسید تحریک نے اسے اور زیادہ جلا دی اور قوم کی تباہی و بربادی نے اسے ایک مخصوص رنگ و آہنگ بخشا اور ہماری ادبی روایت میں ایک نئے رحجان جدید زاویۂ نظر اور نئے تصوّرات کا اضافہ ہوا اور حالی پر ان حالات کا ایسا غلبہ ہوا کہ ہنگامی واقعات نے بھی مستقل صورت اختیار کر لی۔ حالی کی یہی کمزوری ہے کہ وہ جدید خیالات و نظریات کی تبلیغ میں ضرورت سے زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں اور مغربی نظریات و خیالات کو اس حقیقی پس منظر میں پیش کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ افادیت، مقصدیت اور واقعیت کا کسی قدر محدود تصوّر رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو میں یہ تصوّرات سے وہی باقاعدہ مبلغ ہیں اور ان کی شاعری و تنقید دونوں میں ان نظریات کی کارفرمائی ہے اور اس کی سب سے واضح شکل مقدمہ شعر و شاعری ہے۔

اُردو میں مقدمہ شعر و شاعری پہلی تنقیدی کتاب ہے جس میں شاعری کی ماہیت اور اصولِ شعر سے بحث کی گئی ہے۔ متعدد سوالات اُٹھائے گئے ہیں اور اُن کے ذریعہ شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اپنی موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو تنقید میں مستقل حیثیت حاصل ہے۔ ویسے یہ دیوان حالی کا مقدمہ ہے اور اس کا مقصد اصول شاعری کی وضاحت کے ساتھ ساتھ

اپنی شاعری کے لئے وجہ جواز پیدا کرتا تھا۔ اس لئے نظریات تنقید اصول شعر کے ساتھ ساتھ وہ خیالات و رجحانات بھی داخل ہو گئے ہیں جو حالی کی شاعری میں خصوصی طور پر نمایاں ہیں اور اُن کے مخصوص لب و لہجہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وقت کی ضرورتوں قومی مصلحتوں اور اخلاقی و افادی نظریات و رجحانات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حالی اُردو شاعری کے مستقبل کے متعین کرنے میں اُن سے کام لیتے ہیں اور اُنکی مدد سے ایک ایسا نظام شعری مرتب کرنا چاہتے ہیں جو وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ اور شعر و شاعری کے مزاج سے بھی الگ نہ رہے۔ حالی کو اپنے اس مقصد میں کہیں کامیابی ہوئی ہے اور کسی جگہ ناکامی، کہیں ان کے خیالات میں توانائی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور کسی جگہ یہی تصورات شاعرانہ کیفیت سے بالکل عاری ہیں۔ البتہ یہ بات ہر جگہ واضح ہے کہ حالی شاعری سے کام لینا چاہتے ہیں اور اسے قومی زندگی کی بھلائی کے لئے استعمال کرنا ضروری خیال کرتے ہیں ان میں بعض مباحث ایسے بھی ہیں جن کا فن شعر سے براہ راست خاص تعلق نہیں۔ لیکن وقت کی ضرورتوں کے پیش نظر ان کا ذکر حالی بڑی شدت سے کرتے ہیں کیونکہ وہ قوم کے اقبال کے ماتم کو زندگی کا سب سے بڑا فریضہ سمجھتے ہیں اس لئے شعر کو خطاب کرتے وقت اُسے نصیحت کرتے ہیں :-

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجیو نماز تو

پھر بھی اپنے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے شعر کی ماہیت اور اس کی ترقی کے امکانات پر بڑی قابلیت سے بحث کی ہے۔ ان کا نقطہ نظر جامع نہیں مگر اس میں وسعت کے امکانات بہت ہیں وہ مغربی ادب سے واقف نہیں ہیں اس کے مزاج اور اس کی شاعری و انشاپردازی کے صحیح پس منظر تک بھی اُن کی رسائی نہیں ہے لیکن وہ پھر بھی اسکی خصوصیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انھیں اپنے ادبی اصولوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں، وہ مشہور مغربی نقادوں سے واقف نہیں ہیں نہ اُن کا ذکر کرتے ہیں نہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مگر ایک بلند نقّاد اور اچھے شاعر ہونے کی وجہ سے شعر و ادب کے رموز تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگرچہ وہ بعض ایسے مغربی نقادوں کی مدد سے اپنے خیالات آگے بڑھاتے ہیں جو اپنے ادب میں بلند مقام نہیں رکھتے تاہم زمانہ کے حالات سے وہ ان خیالات کو بھی ہم آہنگ کرنے میں بہت کچھ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

مقدمہ کی ابتدا میں حالی شعر کی تاثیر سے بحث کرتے ہیں ان کے خیال میں قدرت نے شاعری کا جو عجیب و غریب ملکہ پیدا کیا ہے اس سے انسانی فلاح و بہبود کے لئے کام لیا جا سکتا ہے اور اس سے کام لیا گیا ہے۔

اس کی تائید میں وہ اپنی معلومات کے تمام خزانوں کو کنگھالتے ہیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں سے ایسی مثالیں جمع کرتے ہیں جو شعر کے اعجاز سے متعلق ہیں۔ یہ بھی وقتی حالات اور ہنگامی حالات کا اثر ہے حالی جب اُردو شاعری کے ذخیرہ پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں وہ توانائی اور قوت نہیں دیکھتے جو انھیں مشرقی اور مغربی علوم کی حکایت میں دکھائی دی تو اُن کا تنقیدی شعور اسی رُخ بہہ نکلتا ہے۔ اور وہ اردو شاعری کو واقعیت اور مقصدیت سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے یہ مجموعہ حکایات شاعری کے متعلق کسی نظریہ کی تشکیل میں مدد نہیں دیتا اور نہ اس سے شعر کی تاثیر کے سلسلہ میں کوئی مستقل قدر پیدا ہوتی ہے لیکن اپنے مقصد میں کسی قدر کامیاب ہیں کیونکہ انحطاط اور زوال کے زمانہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ شعر کی افادیت مسلم ہے چونکہ وہ ذہنی انقلاب کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ اس لئے انس کی افادیت اور مقصدیت پر ابتدا ہی سے زور دیتے ہیں لکھتے ہیں:-

"اس بات سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ہزاروں، لاکھوں آدمی ایسے پیدا ہوئے ہیں جن کو قدرت نے اسی کام کے لئے بنایا تھا اور یہ ملکہ اُن کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اگرچہ اکثر نے اس ملکہ کو مقتضائے فطرت کے خلاف استعمال کیا۔ پس ایک ایسے عطیہ کو جو قدرت نے عنایت کیا ہو صرف اس وجہ سے کہ اکثر لوگ اس کو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں، کسی طرح عبث اور بیکار نہیں کہا جا سکتا۔"

حالی کا افادی پہلو خواہ کتنا ہی محدود ہو اس کا ایک درخشاں پہلو یقینی ہے، ادب کا ایک مقصد ضرور ہوتا ہے حالی سے قبل اردو ادب میں اجتماعی احساس کم تھا زیادہ توجہ داخلی جذبات و احساسات کی طرف تھی بلاشبہ یہ واردات دل اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے اور "جو مزہ آپ بیتی میں ہے وہ جگ بیتی میں نہیں" تاہم جب کوئی احساس شعور کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے تو آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ حالی کا نقطہ نظر اجتماعی شعور اور شعرا کے افادی پہلو پر زیادہ ہے۔ اور اسی نقطہ نظر سے ادب کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہیں اور اسی احساس کو مقدمہ میں تنقید کے اصولوں کے ماتحت منضبط کر دیتے ہیں جس سے اردو میں زندگی اور ادب کا رشتہ واضح شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ رشتہ بدلتے ہوئے حالات میں تہذیبی زندگی کو سنوارنے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔

تنقید کا فرض یہ ہے کہ ادب کے پڑھنے والوں کے دل میں کرید اور تلاش کا جذبہ پیدا کر دے۔ اور ذہن میں فکر اور فن کے بارے میں نئے سوالات پیدا ہوں، قاری کے ذہن صاف ہوں، ان کی قوت تمیز اور ادبی ذوق کو تقویت پہنچے، بہت سے ادبی پہلوؤں کی تشریح ہو جائے، کچھ ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ جائیں۔ شعر کی حقیقت اور ماہیت سامنے آئے۔ خود شاعر اور ادیب کے ساتھ نقاد کا بھی ذہن صاف ہو کچھ لوگ اُسے قبول کریں کچھ بحث و مباحثہ کے ذریعہ منزل تک پہنچیں

کسی جگہ بے ترتیبی میں ترتیب اور کہیں عقائد و خیالات اور نظریات کے تصادم میں مطابقت پیدا ہو۔ غرض ادب، زندگی اور تہذیب کا رشتہ قوی سے قوی تر ہوتا جائے۔ اگر تنقید کے اس فرض کو پیش نظر رکھ کر حالی کے تنقیدی شعور اور مقدمہ کی تنقیدی حیثیت پر غور کیا جائے تو ہمیں مایوسی نہیں ہوتی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہماری زندگی نے جس طرح پلٹے کھائے اور اسے جس بحران سے سابقہ پڑا اس میں یقیناً ہمیں کچھ نئے تصورات اور نئے نظریات کی ضرورت تھی جنھیں نظر انداز کر کے زندگی کے مشکل سوالوں کو حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پرانے ہتھیاروں سے کام نکلتا نظر نہیں آتا تھا۔ جدید ہتھیاروں سے واقفیت نہ تھی۔ اس کشمکش میں زندگی کا سفینہ ڈگمگا رہا تھا۔ حالی کے شعور نے اس تذبذب میں اردو شاعری کی رہنمائی کی یہ رہنمائی خالص ادبی اصولوں کی بنیاد پر نہیں، اس میں اخلاقی و اصلاحی پہلو بھی شامل ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے تحت ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اِن باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔

شعر کی ماہیت کے سلسلہ میں متعدد بنیادی اور ضمنی بحثیں حالی نے اٹھائی ہیں۔ شاعری ناشائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے یا شائستگی کے دور میں بھی قائم رہ سکتی ہے۔ میکالے نے اپنے ملٹن

والے مضمون میں اس مسئلہ کو چھیڑا ہے۔ حالی بھی اس کے اثر سے شاعری کی حیثیت اور اس کے مقام سے بحث کرتے ہیں۔ اس بحث کا تعلق مغربی اثرات اور بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی نظام سے زیادہ تھا۔ شاعری کے موضوع سے براہ راست اس کا تعلق واضح نہیں ہوتا ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی شاعری میں بھی ناگزیر تھی شخصی سلطنت کے زوال نے دربارداری کی رسم کو ختم کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں یہ سوال بہت اہم تھا کہ شاعری اب کیا رُخ اختیار کرے گی اس کے موضوعات میں کس حد تک تبدیلی ہوگی اور بدلتے ہوئے سماج میں اُس کا کیا مقام ہوگا۔ موضوعات میں وسعت اور تنوع کے کیا امکانات ہیں۔ حالی اِن سوالات کو سیاسی وسماجی پس منظر میں اُٹھاتے ہیں اور اپنے مخصوص نقطہ نظر سے اُن کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ نیچرل شاعری والا حصہ اسی جذبے کے تحت لکھا گیا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے حالی کو بعض بنیادی اور ضمنی سوالات کا جواب دینا تھا۔ بری شاعری سے سوسائٹی کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ بری شاعری کا اثر لٹریچر پر کیا ہوتا ہے۔ شاعری کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے۔ قافیہ شعر کے لئے ضروری ہے یا نہیں، شاعری کے لئے کیا شرطیں ضروری ہیں اور شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔

تخئیل، کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ، تفحص الفاظ اور فطرت

انسانی کے مطالعہ کے بغیر شاعر درجہ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ شاعر کے لئے
ان باتوں کی پابندی ضروری ہے ورنہ اس کا کلام محض قافیہ پیمائی
ہو کر رہ جائے گا۔ اصلیت، سادگی، جوش کی صفات دنیا کے بڑے
بڑے شاعروں میں پائی جاتی ہیں۔ حالی نے یہ خیال ملٹن کے یہاں
سے اخذ کیا۔ اور حسب ضرورت انھیں اپنے نظریہ تنقید میں سمونے
کی کوشش کی۔ ملٹن کے نزدیک۔ Paetry is SIMPLE
Sensuou and Passionate

حالی کی رائے میں بھی شعر میں یہ خوبیاں ضروری ہیں۔ انھوں
نے SENSUOUS کا ترجما اصلیت کیا ہے حالانکہ یہاں مراد احساسی
تاثر سے ہے۔ جس میں جذبات کی چاشنی بھی ہوتی ہے اور اصلیت پر مبنی
رنگینی بھی، خود ملٹن کے کلام میں یہ خصوصیت نہیں۔ حالی قدیم شاعری
سے بیزار تھے۔ خاص کر لفظی کاریگری اور مبالغہ کی کثرت نے اُن کے
ذہن کو اور زیادہ مکدّر کر دیا تھا۔ اس اثر کی وجہ سے وہ اپنا نظریۂ شعر
مرتب کرتے وقت شاعری کے جمالیاتی پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور
نہ اس کی شیرینی اور وجدانی کیفیت پر نظر رکھتے ہیں۔ اس خامی کے
باوجود اصلیت سادگی اور جوش کی مدد سے بعض صحت مند رجحانات
پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہیں۔

دوسرا حصّہ غزل کی اہم اصناف پر تنقید سے متعلق ہے اُنھوں
نے جو اُصول بنائے تھے اُنھیں کی روشنی میں ان اصناف کا جائزہ لیا ہے۔

غزل کی اصلاح ان تمام اصناف میں حالی کے نزدیک سب زیادہ ضروری ہے۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے مشورے دئے ہیں۔ اور غزل کے مضامین کے دائرہ کو وسعت دے کر پوری زندگی سے متعلق کر دیا ہے۔ وسعت مضامین کے لحاظ سے یہ حالی کا بڑا کارنامہ ہے۔ حالات کی تبدیلی انھیں مجبور کرتی ہے کہ وہ اسکی اصلاح کے طرف مائل ہوں لیکن انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ غزل میں جو عام دلفریبی ہے۔ اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن زمانہ بآواز بلند کہہ رہا تھا کہ یا تو عمارت میں ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی۔ قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کی بھی موجودہ لَے سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ قصیدہ تو درباروداری کی رسم کے ساتھ رخصت ہوگیا اور مرثیہ کو میرانیس اور مرزا دبیر نے اوج کمال پر پہنچا دیا۔ اس لیے نئی دھن کے شاعروں کو اُن کا مشورہ یہ تھا کہ وہ اس کوچہ میں قدم نہ رکھیں۔ اور مثنوی جو تسلسل بیان کی وجہ سے زندگی کے مسائل بیان کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں صنف سخن تھی وہ عشقیہ مضامین کے دائرہ سے نکل کر پوری زندگی کی ترجمانی کرے۔

کسی نقاد کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے اپنے دور اور آنیوالی نسل کو کس حد تک متاثر کیا۔ حالی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ انھوں نے اردو شعر و ادب کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس کی ترقی کے امکانات زیادہ روشن کر دئے!

ختم شد!

حالی کی اُردو نثر نگاری

ڈاکٹر عبدالقیوم

- حالی وہ کولمبس ہیں جنھوں نے ہمارے لئے ایک ادبی جزیرہ تلاش کیا۔ وہ جزیرہ جو مرزا غالب کہلاتا ہے۔
- حالی کا مقدمہ اُردو تنقید کا عہد نامۂ جدید ہے۔
- حالی نے اُردو میں سوانح نگاری کو ایک مستقل صنفِ ادب بنا دیا۔

یہ ساری باتیں ویسی ہی مسلّمہ حقیقتیں ہیں جیسے یہ بیان کہ "زمین گول ہے" حالی کی نثر کے اثرات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن حالی کی نثر کے ارتقا کی داستان اب تک "اَن کہی" رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے پہلی بار اس داستان کو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ حالی کے ذہنی اور ادبی زندگی کے سیاح ہیں اور اس سیاحت کی زندہ روداد اُن کی یہ تحقیقی کتاب ہے۔

"حالی کی نثر" حالی کی کہانی بھی ہے اور اُردو نثر کے عہدِ تشکیل کی دستاویز بھی۔ - - - - - - قیمت

تاریخ ادبِ اُردو (مرتبہ ڈاکٹر عبدالقیوم) قیمت:- آٹھ روپے

کلیاتِ حالی " " " - - - - - زیرِ طبع

مشتاق بُک ڈپو، کراچی ۱